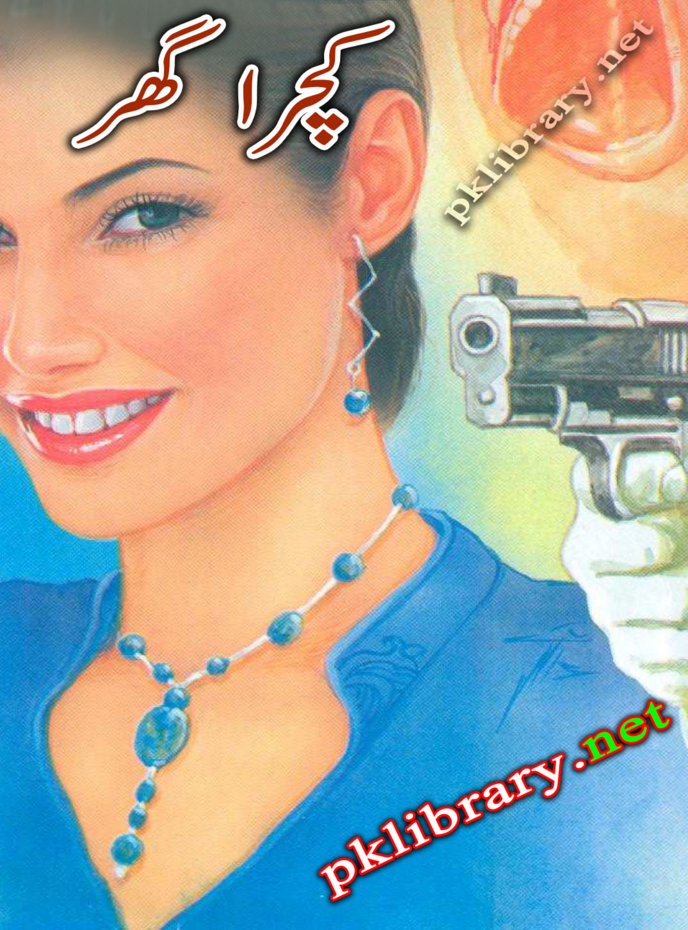

pklibrary.net
pklibrary.net

www.pklibrary.net

کچرا گھر

۳۱ دسمبر ۱۹۷۸ء کی رات ہے۔ آدھی رات کو ٹھیک بارہ بجے کی پہلی "ٹن" کے ساتھ یہ سال گزر جائے گا۔ پھر بارہ بجے کی آخری "ٹن" کے ساتھ بچوں کا عالمی سال شروع ہو جائے گا۔ ابھی گھڑی کا چھوٹا کانٹا بارہ پر ہے اور بڑا کانٹا بارہ پر آنے والا ہے۔ جب دونوں کانٹے مل جائیں گے اور بارہ بج جائیں گے تو پھر اس دنیا کے تمام بڑے کانٹے پھول جیسے بچوں کے بارہ بجانا شروع کر دیں گے۔

دسمبر کی رات سرد اور کہر آلود ہے۔ کہر کے دھند لکے میں ایک کچرا گھر کی چار دیواری نظر آ رہی ہے۔ آس پاس جتنے مکانات اور دکانیں، اسکول اور پارک وغیرہ ہیں ان سب کا کچرا وہاں آکر جمع ہوتا رہتا ہے۔ اب وہ کچرا گھر ہاؤس فل ہو چکا ہے۔ ایک پیٹو کی طرح بد ہضمی کا شکار ہو کر قے کر رہا ہے اور کچرے کو باہر سڑک کی طرف اگلتا جا رہا ہے۔

اب دونوں کانٹے مل رہے ہیں۔ گھڑی کا پنڈولم لرزتے ہوئے پہلی آواز دے رہا ہے۔ ٹن......

ٹن...... ایک بڑی سی قیمتی کار سڑک کے کنارے آکر رک رہی ہے۔ اس کی ہیڈ لائٹیں بجھ رہی ہیں۔ کار کے اندر تاریکی ہے۔ اگلی سیٹ پر دو سائے نظر آ رہے ہیں۔ وہ انسان ہیں مگر تاریکی میں وہ بھوت نظر آ رہے ہیں۔

www.pklibrary.net

ٹن......وہ کار میں چھپے ہوئے محتاط نظروں سے باہر دور تک دیکھ رہے ہیں۔ وہ مجرم ہوسکتے ہیں۔

ٹن...... وہ جاسوس ہوسکتے ہیں۔ چھپ کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ جرائم کی تکمیل کیسے ہوتی ہے؟

ٹن...... وہ میونسپلٹی کے آفیسر ہوسکتے ہیں جو یہ سمجھنے آئے ہیں کہ ان کے محکمے کے لوگ اس کچرا گھر میں کچرے کی تاریخ کیسے مرتب کررہے ہیں؟"

ٹن...... ایک سایہ کار کا دروازہ کھول کر باہر آگیا ہے اور اب پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول رہا ہے۔

ٹن...... دروازہ کھلنے سے کار کے اندر دھیمی سی روشنی ہوجاتی ہے۔ اس روشنی میں پچھلی سیٹ پر کچرا نظر آرہا ہے۔"

ٹن...... ہمارے شہروں میں کچرا پھینکنے والوں کے لئے معقول انتظام نہیں ہے۔ کچرا گھر گھر سے اتنی دور ہوتا ہے کہ بعض بیچاروں کو کار میں کچرا لاد کر لانا پڑتا ہے۔

ٹن...... اس نے کچرے کی باسکٹ اٹھالی ہے اور پچھلا دروازہ بند کررہا ہے۔

ٹن...... رات بڑی سرد ہے۔ وہ باسکٹ اٹھائے تھر تھر کانپ رہا ہے اور ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے کچرا گھر کی طرف بڑھتا جارہا ہے۔ ٹن...... بچوں کا عالمی سال۔ کچرے کی بیچ باہر تک بجی ہے۔ اس نے اس بیچ پر باسکٹ رکھ دی ہے اور اب واپس جارہا ہے۔

آخری ٹن...... بچوں کا عالمی سال شروع ہوچکا ہے۔ باسکٹ کی گود میں ایک بچہ رو رہا ہے۔ نئے سال کی پہلی آواز سنا رہا ہے۔

کچرے کی تعریف یہ ہے کہ غیر ضروری سامان، تن کی غلاظتیں اور انسان کی نجاستیں جو گھر سے باہر پھینکی جاتی ہیں، وہ کچرا کہلاتی ہیں اور کچرا گھر کی تعریف یہ ہے کہ کوئی انگلی اٹھا کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ کون سا کچرا کس کے گھر سے آیا ہے۔ وہ سارے عالم کا کچرا ہے اور وہاں وہ سارے عالم کا بچہ ہے۔ وہ بچہ میرا ہے، وہ آپ کا ہے اور وہ بچہ آپ سب کا ہے۔ عالمی سال کا عالمی بچہ ہے۔

میرا نام نظام ہے۔ چونکہ میں بوڑھا ہوں اس لئے تمام بچے مجھے نظام بابا کہتے ہیں۔ میں مملکت کچرا آباد کا حاکم ہوں۔ میرے حکم کے بغیر کچرے کا ایک تنکا بھی ادھر سے ادھر

www.pklibrary.net

نہیں ہل سکتا ہے اور نہ ہی کوئی بچہ میری اجازت کے بغیر ٹوٹے پھوٹے کھلونے اور روٹی کے ٹکڑے وہاں سے چن سکتا ہے۔ میرے پاس ہمیشہ ایک چابک رہتا ہے۔ اسے دیکھ کر کچرا چننے والے بوڑھے اور بچے سہم کر دور بھاگ جاتے ہیں یا پھر میرے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

میں گرمی کے موسم میں کچرا گھر کے باہر سوتا ہوں۔ سردی اور بارش کے دنوں میں کوڑا کرکٹ کا کچھ حصہ اس گھر سے باہر نکال دیتا ہوں۔ اس طرح وہاں میرے رہنے اور سونے کی جگہ بن جاتی ہے۔

اس رات میں بڑے آرام سے کچرے کی سیج پر سو رہا تھا کہ اچانک ہی آنکھ کھل گئی۔ ایک بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی' آواز بہت ہی قریب تھی۔ میں نے کچرا گھر سے سر نکال کر دیکھا۔ پہلے تو کچھ نظر نہ آیا پھر ایک کار اسٹارٹ ہو کر مڑنے لگی تو اس کی ہیڈ لائٹوں کی روشنی گھومتی ہوئی ایک باسکٹ پر سے پھسلتی ہوئی گزر گئی۔ اس کے بعد وہ کار تیز رفتاری سے بھاگتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

بچہ رو رہا تھا۔ شاید اسے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ میں کچرے پر سے چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتا ہوا باسکٹ کے پاس آیا اور اسے قریب کھینچ کر اس کے اندر ہاتھ ڈالا۔ بچہ کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔ صرف اس کا سر کمبل سے باہر تھا۔ وہاں کچھ تاریکی تھی اور کچھ میری نظریں کمزور تھیں۔ اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بس اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ بچہ نہیں بچی ہے۔

میں نے کمبل سمیت اسے اٹھا کر سینے سے لگایا پھر وہاں سے اٹھ کر دور دور تک دیکھتے ہوئے چیخنے لگا۔

"یہ بچی کس کی ہے؟ اسے کس نے یہاں پھینکا ہے؟ ارے یہ کچرا نہیں ہے......"

میں چیختے ہوئے بچی کو اٹھائے ادھر سے ادھر بھاگنے لگا۔ شاید اسے چھوڑنے والے نظر آ جائیں۔ شاید میری آواز پر کسی باپ کی غیرت واپس آ جائے۔ بچی آواز دے رہی تھی۔ شاید کسی ماں کی ممتا جاگ جائے۔ مگر یہ رات کی تاریکی بڑی حرام زادی ہوتی ہے۔ حرام جننے کے بعد گونگی بہری بن جاتی ہے۔

میں چیختے چیختے تھک گیا۔ مجھے سردی لگ رہی تھی۔ میرے دانت بج رہے تھے۔ بچی

www.pklibrary.net

بھی روئے جا رہی تھی۔ میں باسکٹ اٹھا کر کچرا گھر میں آگیا۔ اسی وقت بچی تھوڑی دیر کے لئے چپ ہوگئی۔ شاید اسے حرارت مل رہی تھی۔ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں بڑی گرمی ہوتی ہے۔ سگریٹ کے ٹوٹے سے بکھرے ہوئے تمباکو کی بو۔ مچھلی، گوشت اور انڈے وغیرہ کی بساند، باسی چیزوں کی سڑاند اور طرح طرح کی بدبوئیں جن کو نام نہیں دیئے جاسکتے لیکن جن کی تاثیر سمجھ میں آتی ہے۔ اس ساری عفونت کے باعث کچرا گھر کی فضا گرم ہوجاتی ہے۔

جب وہ حرارت پاکر چپ ہوئی تو میں سوچنے لگا۔ اس بچی کا کیا کروں؟ اسے کہاں چھوڑ کر آؤں؟ میں نے آج تک اپنے گھر کا کچرا کسی دوسرے کے دروازے پر نہیں پھینکا۔ دوسروں کی پھینکی ہوئی چیزوں کو سمیٹتا رہا ہوں۔ اب تقدیر نے زندہ کچرا لاکر میری گود میں ڈال دیا تھا۔ مجھے بچے پالنا نہیں آتا تھا۔ میں بھلا اس کی پرورش کیسے کرسکتا تھا؟

وہ پھر رونے لگی۔ بڑی نخریلی تھی۔ کسی بڑے گھر کی بیٹی تھی۔ میں "او۔ او۔ آ۔ آ۔" کی آوازیں نکالتے ہوئے اسے اپنے بازوؤں میں جھلانے لگا لیکن وہ چپ نہیں ہو رہی تھی۔ یقیناً اسے بھوک لگ رہی تھی۔ میں اسے دودھ کہاں سے پلاتا؟ بڑے گھر کے لوگ دودھ کے ڈبے پھینکتے تو انہیں کھرچنے سے تھوڑا بہت دودھ کا پاؤڈر نکل آتا تھا لیکن اس وقت وہ بھی نہیں تھا۔

پھر میں نے سوچا کہ جو اسے چھوڑ گیا ہے، وہ اس کا گلا دبا کر مار بھی سکتا تھا لیکن اس خیال سے چھوڑ گیا ہے کہ شاید زندہ بچ جائے۔ اگر ایسا ہے تو پھر اس کی زندگی کا کچھ سامان بھی کیا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی میں باسکٹ میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ وہاں بچی کے چھوٹے چھوٹے لباس تھے۔ لباس کے اندر کاغذوں کی ایک گڈی بھی تھی۔ سکہ راج الوقت اندھیرے میں نظر آجاتا ہے۔ نوٹوں کی بو ہزاروں میں پہچانی جاسکتی ہے۔ میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ وہ بچی تو میرا مقدر چمکانے آئی تھی۔

وہ کتنی رقم ہوگی؟ نوٹوں کو گننے کے لئے دل مچل رہا تھا لیکن وہ رو رہی تھی۔ اس کی آواز سن کر رات کو پہرہ دینے والا چوکیدار یا گشت کرنے والے سپاہی آسکتے تھے اور ہاتھ آئی ہوئی دولت تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نے باسکٹ کی مزید تلاشی لی تو ایک چھوٹی سی شیشی ہاتھ میں آئی اسے کھول کر سونگھنے سے پتہ چلا کہ شہد ہے۔ میں نے فوراً ہی ایک انگلی شہد

www.pklibrary.net

میں بھگو کر بچی کے منہ میں رکھ دی۔ وہ ایک دم سے چپ ہوگئی۔

وہ میری انگلی کو چوس رہی تھی۔ اس کے ننھے سے ہونٹ ایسے ملائم سے تھے کہ ماکھن کی ملائمت بھی کچھ نہ ہوگی۔ وہ میری انگلی کو منہ میں کھینچ رہی تھی اور میرا دل اس کی طرف کھنچا جارہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ ماؤں کے دل کتنی شدت سے اپنی تخلیق کی طرف کھنچے جاتے ہوں گے۔ سچ کہتا ہوں' اس وقت میرے اندر ممتا پیدا ہو رہی تھی۔ ایسا یقین پیدا ہو رہا تھا کہ وہ ساری کی ساری میری ہے۔ میں اب تک کپڑوں کا مالک تھا۔ اب ایک جیتی جاگتی بچی کا بلا شرکت غیرے مالک بن گیا تھا۔

وہ انگلی چوستے چوستے سوگئی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اسے سوکھی گھاس اور سڑی ہوئی سبزیوں کے بستر پر سلا دیا۔ اس کی ماں اگر سنگ دل نہیں ہوگی' تو اپنی ائیر کنڈیشنڈ خواب گاہ کے معطر ماحول میں اس بدبو سے گھبرا کر بار بار سانس روک رہی ہوگی جو اس کی نوزائیدہ بیٹی کے بستر سے اٹھ رہی تھی۔ ایسی بدنصیب بد عقل عورتیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے بدن کی خوشبو نوچ کر پھینک دیتی ہیں اور ساری عمر پچھتاوے کی بدبو میں سانس لیتی رہتی ہیں۔

میں نے نوٹوں کی گڈی اٹھائی۔ اس گڈی میں سو سو کے نوٹ تھے۔ میں نے گنتی شروع کی ایک سے پچاس تک گنتا چلا گیا یعنی پورے پانچ ہزار روپے تھے۔ مجھے یاد نہیں آیا کہ میں نے کبھی اتنے سارے روپے اکٹھے دیکھے تھے۔ وہ روپے اب میرے تھے۔ بالشت بھر کی بچی انہیں خرچ نہیں کر سکتی تھی۔ اتنی بڑی رقم اس کے ساتھ اس لئے رکھی گئی تھی کہ اسے اٹھانے والا بچی کو بھی اٹھائے۔ دوسرے لفظوں میں وہ بچی کو گود لینے کا معاوضہ تھا۔

لیکن اتنی بڑی رقم دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ میں اسے کہاں چھپاؤں؟ پولیس والے مجھے اس رقم کے ساتھ دیکھ کر یہی کہیں گے کہ میں نے کسی کے گناہ کو چھپانے کا معاوضہ لیا ہے پھر وہ میرے پیچھے پڑ جائیں گے کہ میں بچی کے ماں باپ کا نام پتا بتاؤں۔ نہیں بتا سکوں گا تو ڈنڈے پڑیں گے۔ میں بینک میں اکاؤنٹ نہیں کھول سکتا تھا۔ کیونکہ میں بعض سیاسی پارٹیوں کی طرح حساب نہیں دے سکتا تھا۔ یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ پانچ ہزار کی فارن ایڈ مجھ تک کیسے پہنچی ہے؟

www.pklibrary.net

دولت آتی ہے تو پریشانیاں لے کر آتی ہے۔ مزید پریشانی یہ تھی کہ وہ رقم کوڑا کرکٹ کی تہ میں چھپا کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ میونسپلٹی والوں کی طرف سے خطرہ نہیں تھا کہ وہ کچرا گھر کی صفائی کے لئے آئیں گے۔ خطرہ سیاسی لیڈروں سے تھا۔ الیکشن کے دن قریب آرہے تھے۔ لیڈر حضرات اپنی کارکردگی سے متاثر کرنے کے لئے اپنے اپنے علاقوں میں اسکول اور ہسپتال کھولنے' سڑکیں بنوانے' پانی فراہم کرنے اور تمام علاقوں کو صاف ستھرا رکھنے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ کسی دن وہ معتروں کو لے کر اس کچرا گھر کی صفائی کے لئے بھی آسکتے تھے۔ اس لئے میں وہ رقم کچرے کی تہ میں چھپا کر نہیں رکھ سکتا تھا۔

سوچتے سوچتے بہت دیر ہوگئی۔ رات گزرنے لگی۔ تب سمجھ میں آیا کہ دولت آتی ہے تو نیند کیوں نہیں آتی۔ غریب دولت مند چوروں کے ڈر سے نہیں سوتے اور امیر دولت مندوں کو انکم ٹیکس والے سونے نہیں دیتے۔ آخر میرے دماغ نے سمجھایا کہ میں یہ دولت لے کر کیا کروں گا؟ مجھے تینوں وقت جھوٹا اور باسی کھانے کو مل جاتا تھا۔ پہننے کے لئے چیتھڑے میسر تھے۔ رہنے کے لئے مکان تھا۔ دل میں کوئی آرزو نہیں تھی ورنہ اس کی تکمیل کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوتی۔ جینے کی امنگ بھی نہیں تھی کہ مستقبل کے لئے بچت اسکیم پر عمل کرتا۔ پھر رقم میرے کس کام آسکتی تھی؟

بے شک میں اتنی بڑی رقم دیکھتے ہی خوشی سے کھل گیا تھا۔ یہ اس لئے کہ انسان کو دولت کی ہوس ورثے میں ملتی ہے۔ پیسے کی ضرورت ہو یا نہ ہو' اسے دیکھ کر ضرور خوشی ہوتی ہے۔ بہرحال جلد ہی یہ بات سمجھ میں آگئی کہ مجھے خوش نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے اپنی زندگی میں جتنا پایا' اس سے زیادہ کھو دیا۔ یہ رقم اور یہ بچی صبح ہوتے ہی چلی جائیں گی۔

کچرا آباد کی صبح اس طرح ہوتی ہے کہ اذان کے بعد سب سے پہلے میری حکومت کا راشننگ آفیسر آتا ہے۔ وہ بارہ برس کا ایک لڑکا ہے۔ اس کا نام کھاتو ہے۔ اس لئے کہ بہت کھاتا ہے۔ اس کی ڈیوٹی یہ ہے کہ باہر سے کھانے کا جتنا سامان میری مملکت میں پھینکا جاتا ہے وہ ان سب کو بٹور کر ایک جگہ رکھتا ہے۔ آس پاس کے فلیٹ' کوٹھیوں اور دکانوں سے صبح پانچ بجے سے لے کر دن کے گیارہ بجے تک ہمارے لئے ناشتہ پہنچتا رہتا ہے۔ گیارہ بجے سب سے پہلے اچھی چیزوں کا انتخاب کرکے میں خود کھاتا ہوں۔ کھاتو اور

www.pklibrary.net

کچرا چننے والے دوسرے بچے میرا منہ تکتے رہتے ہیں۔ جب میرا پیٹ بھر جاتا ہے تو کھاتو میرا جھوٹا کھانے کے لئے بیٹھتا ہے اور دوسرے بچے اسی طرح منہ تکتے رہتے ہیں پھر اس کا جھوٹا کھانا کھانے کے لئے دس برس کی ایک لڑکی کچرے کے دسترخوان پر آکر بیٹھتی ہے۔

اس لڑکی کا نام سکینہ ہے۔ کچرا آباد میں جو خالی ڈبے اور خالی بوتلیں درآمد ہوتی ہیں' انہیں سکینہ سنبھال کر رکھتی ہے۔ چھوٹے بڑے کاغذات چن کر ان کا پلندہ بنا کر باندھتی ہے۔ یہ تمام مال' ردی اور شیشے بوتل خریدنے والوں کو فروخت کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے بچے' راشد' خالدہ' للو اور منور وغیرہ اس کچرے سے بھوسی ٹکڑے' ٹوٹے ہوئے کھلونے' بٹن اور ہیرپن جیسی بہت سی چیزیں نکال کر جمع کرتے ہیں۔ تمام دن محنت کرتے ہیں۔ اس لئے میں انہیں تین وقت بچا ہوا کھانا دیتا ہوں۔ ردی بیچنے سے جو تھوڑی بہت رقم ہاتھ آتی ہے۔ اس میں سے مہتروں کو دیتا ہوں تاکہ وہ صفائی نہ کریں۔ پولیس والوں کو دیتا ہوں تاکہ وہ مجھے کچرا گھر سے بے دخل نہ کریں۔ کچھ اپنے کھانسی بخار کے لئے رکھتا ہوں۔ باقی پیسے بچوں میں تقسیم کر دیتا ہوں۔

○☆○

نئے سال کی پہلی صبح میری گود میں ایک ننھی سی بچی کو دیکھ کر تمام بچے ٹھٹک گئے۔ وہ بچی اتنی حسین تھی کہ اس گندگی کے ڈھیر میں اسے دیکھ کر خود مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ میری گود میں رکھی ہوئی ہے لیکن دوسرے بچے کچھ اور ہی سوچ کر ٹھٹک گئے تھے۔ راشد نے پوچھا۔

"نظام بابا یہ بھی ہمارے حصے سے کھایا کرے گی؟"

وہ بڑا اہم سوال تھا۔ کوئی اپنے حصے کی روٹی کسی کو نہیں دینا چاہتا۔ کچرا آباد کی آبادی میں ایک بچی کا اضافہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو میں اس بچی کو ٹھکانے لگا کر آتا ہوں۔ میرے واپس آنے تک کوئی یہاں کھانے میں بے ایمانی نہ کرے۔ ورنہ میں چابک سے کھال ادھیڑ ڈالوں گا۔"

میں بچی کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر وہاں سے اٹھ گیا۔ کتنے ہی لڑکے لڑکیاں صاف ستھرے لباس پہنے اسکول جا رہے تھے۔ ایک دکاندار نے پوچھا۔

www.pklibrary.net

"اے بڈھے کیا لے جا رہا ہے؟"

"ایک بچی ہے۔"

"کس کی ہے؟"

"آپ ہی کی ہے جی......."

وہ ہنسنے لگا۔ پتا نہیں لوگ بات سمجھے بغیر کیوں ہنس دیتے ہیں۔ آگے ایک فلیٹ کے دروازے پر ایک عورت اپنے بیٹے کو اسکول کے لئے رخصت کر رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"نظام بابا! اتنے صاف ستھرے کپڑے میں کیا لے جا رہے ہو؟"

میں نے قریب پہنچ کر اسے بچی دکھائی۔ وہ حیرانی سے بولی۔

"اللہ کتنی خوب صورت ہے۔ کس کی ہے؟"

"آپ ہی کی ہے بی بی جی!"

"اے خدا نہ کرے کہ میری ہو۔" وہ ناراض ہو گئی۔ "کیا مجھے میرے میاں سے جوتیاں کھلانا چاہتے ہو۔ سچ بتاؤ۔ اسے کہاں سے لائے ہو؟"

"بی بی جی! میں کسی کچرے کا حساب نہیں لگا سکتا کہ وہ کس کے گھر سے آیا ہے۔ اس کچرا گھر میں بہت سی قابل نفرت اور شرمناک چیزیں آتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔"

میں آگے بڑھ گیا۔ میرے ساتھ ساتھ اس علاقے میں یہ بات پھیل گئی کہ کچرا گھر کے بڈھے کی گود میں کوئی ایک نوزائیدہ بچی کو چھوڑ گیا ہے۔ میں سوالوں اور جوابوں سے گزرتا ہوا پولیس اسٹیشن کے احاطے میں پہنچ گیا۔ سپاہی نے مجھے اندر نہیں جانے دیا۔ میرے بدن پر گرد و غبار کی اتنی تہیں جمی رہتی ہیں کہ لوگ مجھے دیکھتے ہی ناک سکوڑنے لگتے ہیں۔ اتفاق سے تھانے کا انچارج اس وقت ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لئے آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"جناب! کل رات کچرا گھر میں کوئی اس بچی کو چھوڑ گیا ہے؟"

تھانیدار کی بھویں سکڑ گئیں۔ تیور بدل گئے۔ اس نے غرا کر پوچھا۔

"ہوں کوئی چھوڑ کر گیا ہے یا تمہیں دے گیا ہے؟ اندر آؤ۔"

www.pklibrary.net

آخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ اگر کوئی چوری کا مال پاکر واپس کرنے جائے تو تھانے کے دروازے پر پہنچتے ہی خود چور کہلانے لگتا ہے۔ تھانیدار نے دفتر کے کمرے میں پہنچتے ہی میز پر سے بید کی لمبی چھڑی اٹھالی پھر گرج کر کہا۔

"سچ سچ بتادے۔ اگر کسی رئیس کی بچی ہے تو میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

"جناب! یہ کسی بہت ہی مالدار کی بیٹی ہے مگر میں اسے جانتا نہیں ہوں۔"

"ابے جب تو جانتا نہیں ہے تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ بہت مالدار ہے؟"

"وہ ایسے معلوم ہوا جی کہ جس باسکٹ میں یہ بچی تھی' اس میں پانچ ہزار روپے بھی تھے۔"

"پانچ ہزار!" تھانیدار کے ہاتھ سے چھڑی گر پڑی۔ وہ ایک دم سے محتاط ہوگیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا لیکن ایک سپاہی کمرے میں داخل ہونا چاہ رہا تھا۔ اس نے سپاہی سے کہا۔

"تم دروازہ بند کر کے باہر کھڑے رہو۔ میں اس بڈھے سے بچی کے ماں باپ کا پتا معلوم کر رہا ہوں۔"

سپاہی نے جا کر دروازہ بند کر دیا۔ تھانیدار نے بڑی رازداری سے پوچھا۔

"کہاں ہیں وہ پانچ ہزار؟"

میں نے بچی کو میز پر لٹا دیا پھر اپنے میلے چیکٹ اوورکوٹ کی اندرونی جیب سے پانچ ہزار کی گڈی نکال کر اس کے آگے رکھ دی۔ اس نے لپک کر اسے اٹھایا محتاط نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا پھر نوٹ گننے لگا اور ہانپنے لگا۔ اضطراب کی حالت میں بار بار گنتی بھولنے لگا۔ پھر گڈی کو جیب میں ٹھونستے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہی ہوں گے۔ میں جانتا ہوں تم بہت ایماندار ہو۔ ایک عرصے سے اس کچرا گھر میں رہتے آرہے ہو۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو میں اسے حوالات میں بند کر دیتا۔"

"مہربانی ہے جناب! اب میں جاؤں۔"

"ٹھہرو میں ابھی رپوٹ لکھوں گا۔ پھر آج کسی وقت اخبارات کے رپوٹرز اور فوٹو گرافرز تمہارے پاس آئیں گے۔ تم ان سے کہنا کہ باسکٹ میں صرف بچی تھی۔ پانچ ہزار کا ذکر نہ کرنا۔"

www.pklibrary.net

"نہیں کروں گا۔ اب میں جاؤں۔"

"ہاں۔ مگر اچھی طرح یاد رکھو۔ پانچ ہزار کا ذکر کسی کے سامنے نہ کرنا ورنہ میں تمہیں پکڑا گھر سے بھگا دوں گا۔"

"نہیں جناب! ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔ آپ مجھے وہاں سے نہ نکالیں۔"

"اچھا جاؤ۔ میں رپوٹ درج کرلوں گا۔"

میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے ڈانٹ کر بچی کی طرف اشارہ کیا۔

"ابے اس لعنت کو تو لے جا۔"

میں نے پلٹ کر بچی کی طرف دیکھا پھر پریشان ہو کر پوچھا "آ۔ آپ اسے تھانے میں جمع نہیں کریں گے؟"

"تیرا دماغ چل گیا ہے۔ یہ کوئی جمع کرنے والی چیز ہے؟ اٹھا کر لے جا' اس حرام کی اولاد کو......"

کیسی عجیب بات ہے' وہ بچی حرام سمجھی جارہی تھی۔ اس کے پیسے حرام نہیں تھے۔ تھانیدار نے سپاہی کو دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔ میں نے بچی کو اٹھالیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"بچی کی ذمے داری تجھ پر ہے۔ اگر تو اسے کہیں پھینکے گا یا ہماری اجازت کے بغیر کسی کو دے گا تو پھر سمجھ لے تیری شامت آجائے گی۔"

میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا پولیس اسٹیشن سے باہر آگیا۔ پانچ ہزار کا بوجھ سر سے اتر گیا تھا۔ اب میں رات کو آرام سے سو سکتا تھا۔ صرف وہ بچی مصیبت بن کر چپک گئی تھی۔ اب تو اس کی ذمے داری بھی مجھ پر عائد کر دی گئی تھی۔ میں بڑبڑاتا ہوا اپنے محلے میں داخل ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ خبر پھیل گئی کہ نظام بابا بچی کو لے کر واپس آرہا ہے۔

دکانوں سے لوگ باہر آگئے۔ مکانوں کے کھڑکی دروازے کھلتے چلے گئے۔ موٹر ورکشاپ میں کام کرنے والے مجھے دیکھنے لگے۔ زیر تعمیر بلڈنگ کی نچلی منزل سے پانچویں منزل تک کام کرنے والے مزدور کام چھوڑ کر دور سے ہی گود کی بچی کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں جہاں سے میں گزرتا تھا' وہیں سے آوازیں آتی تھیں۔ کوئی پوچھتا تھا۔

"کیا یہ زندہ ہے؟"

www.pklibrary.net

کسی نے مشورہ دیا۔ "اسے تھانے میں لے جا کر رپورٹ لکھواؤ۔"
کسی نے پوچھا۔ "کون اسے چھوڑ گیا تھا؟ کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟"
میں انہیں جواب دیتا ہوا ایک گلی میں داخل ہوا۔ ایک عورت نے نفرت سے تھوک کر دروازہ بند کرلیا۔ ذرا آگے بڑھا تو ایک عورت نے کھڑکی سے سرگوشی کی۔
"اسے ذرا دکھاؤ تو؟"
میں نے کھڑکی کی قریب جا کر اسے دکھایا۔ بچی رونے لگی۔ عورت نے کہا۔
"ہائے کتنی خوب صورت ہے۔ اسے بھوک لگ رہی ہے۔"
"بی بی جی! آپ کے بچے کا جھوٹا دودھ ہو تو دے دیں۔ میں اسے پلاؤں گا۔"
دوسری کھڑکی سے ایک بوڑھی عورت نے کہا۔
"اے بڈھے! بچی کو دو دن تک دودھ نہ پلانا۔ صرف شہد چاٹنے کے لئے دینا۔"
میں جلدی جلدی پکڑا گھر کی طرف جانے لگا تاکہ شہد چٹا کر اسے چپ کرا سکوں۔
آگے ایک مکان کا دروازہ کھلا۔ ایک مرد نے چھوٹی سی شیشی بڑھاتے ہوئے کہا۔
"یہ لو' اس میں شہد ہے۔"
میں شہد لینے کے لئے آگے بڑھا۔ اس سے پہلے ہی ایک عورت نے اس مرد کا ہاتھ پکڑ کر اسے مکان کے اندر کھینچ لیا۔ دروازہ ایک دھڑاکے سے بند ہوا۔ پھر اندر سے آواز آنے لگی۔ وہ بول رہی تھی۔
"آپ کو اس سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟ سچ سچ بتایئے کیا یہ آپ کی اسی چہیتی نے تو جن کر نہیں پھینکا۔"
مرد کی آواز آئی۔ "بانو! میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔ آہستہ بولو ورنہ محلے والے مجھے سچ مچ گناہ گار سمجھیں گے۔ پولیس والے مجھے پکڑ کر لے جائیں گے۔"
"آپ میرے سر کی قسم کھائیں کہ آپ شازیہ سے نہیں ملتے ہیں۔"
"میں تمہارے سر کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے پچھلے تین ماہ سے شازیہ کو دیکھا بھی نہیں ہے۔"
میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہا۔
"بھائی جی آپ تین ماہ سے نہیں ملے مگر تین ماہ پہلے تو کسی شازیہ سے ملے تھے۔ یہ

www.pklibrary.net

بچی تو نو ماہ کا سفر کر کے آئی ہے۔ بس میں سمجھ گیا۔ اب باہر آ کر بچی کو لے لو۔"
میری بات پوری ہوتے ہی دروازہ کھلا۔ دو ہاتھوں نے ایک جھٹکے سے مجھے اندر کھینچا
پھر دروازہ بند ہو گیا۔ بچی اب تک رو رہی تھی۔ شازیہ کے عاشق نے کہا۔
"یہ لو شہد پہلے بچی کو چپ کراؤ۔"
میں نے بچی کو اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
"میں کیوں چپ کراؤں۔ تمہاری بچی ہے۔ تم سنبھالو۔"
اس شخص نے مجھے غصے سے دیکھا' پھر اپنی بیوی سے کہا۔
"بانو! دیکھو تمہارے ذرا سے شک نے میرے لئے کیسی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔
کیا تمہارا چیخنا کم تھا کہ اب یہ بچی بھی میرے خلاف چیخنے لگی ہے۔ ارے خدا کے لئے
اسے چپ کراؤ۔"
اسے بھلا کون چپ کراتا؟ وہ میری نہیں تھی۔ وہ بانو کی بھی نہیں تھی۔ گناہ گار خود
اپنے گناہ کی آواز کو دباتا ہے۔ مجبوراً شازیہ کے عاشق نے بچی کو مجھ سے لے لیا پھر شہد
میں انگلی ڈبو کر اس کے چیختے ہوئے منہ میں ڈال دی۔ بچی فوراً ہی چپ ہو گئی۔ تب بانو
نے ہاتھ نچا کر کہا۔
"ہاں۔ اب بتاؤ۔ یہ تمہاری نہیں ہے تو تمہارے پاس آتے ہی چپ کیسے ہو گئی؟"
اس نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔
"خدا کے لئے عقل سے کام لو۔ یہ میرے پاس آ کر نہیں' شہد کی مٹھاس پا کر چپ
ہوئی ہے۔"
"شہد کی مٹھاس پا کر نہیں' اپنے باپ کی مٹھاس پا کر۔ آپ مجھے بے وقوف نہیں بنا
سکیں گے۔"
شوہر نے بڑی بے بسی اور عاجزی سے کہا "اے میری شریک حیات! اگر تم میری
زندگی کی ساتھی ہو تو میری جان کی دشمن نہ بنو۔ ذرا عقل سے کام لے کر یہ سوچو کہ یہ
بات جب گھر کی چار دیواری سے باہر جائے گی تو لوگ مجھے گناہ گار سمجھ کر پتھر ماریں گے۔
میری بے عزتی ہو گی اور مجھے جان سے مارا ڈالا جائے گا۔ کیا تم بیوہ ہو کر زندگی گزار
سکو گی؟"

www.pklibrary.net

بانو گھبرا گئی۔ ہچکچاتے ہوئے بولی

"مم۔ میں باہر والوں سے کہنے نہیں جا رہی ہوں گھر کے اندر ہی اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔"

"تم اپنے نصیبوں کو رو رہی ہو۔ یہ نہیں سمجھتیں کہ یہ نظام بابا گھر سے باہر جا کر سارے محلے میں ڈنکا پیٹنا شروع کر دے گا کہ یہ بچی میری ہے۔ تب کیا ہو گا؟"

تب بانو کو جیسے عقل آ گئی۔ اس نے گھور کر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے اس کی کیا مجال ہے۔ یہ تو ہمارا پھینکا ہوا کھاتا ہے۔ ہمارا کھائے گا اور ہم پر ہی غرائے گا؟ واپس کر دو اس کی بچی........"

اس نے بچی کو واپس دیا۔ میں لینا نہیں چاہتا تھا لیکن میرے ہاتھ آپ ہی آپ آگے بڑھ گئے۔ یہ ایک فطری عمل تھا۔ برسوں سے مجھے کچرا سمیٹنے کی عادت تھی۔ جب بھی کوئی کچھ پھینکتا ہے میرے دونوں ہاتھ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لئے میرے بڑھے ہوئے ہاتھوں میں وہ بچی واپس آ گئی پھر اس سے پہلے کہ میں احتجاج کرتا۔ وہ دروازہ دوبارہ کھلا۔ مرد نے مجھے دھکا دیا۔ عورت نے انگلی اٹھا کر دھمکی دی۔

"بڈھے خبیث! اگر کسی سے کچھ کہا اور میرے سرتاج کو بدنام کرنے کی کوشش کی تو تجھے کچرا گھر سے بھگا دوں گی۔ پھر تجھے بھیک مانگنے سے بھی اتنی روٹیاں نہیں ملیں گی جتنی کہ اس محلے سے مل جایا کرتی ہیں۔ چل جا' اب یہاں سے بھاگ جا......."

میں وہاں سے بھاگ آیا کیونکہ اقتدار کی کرسی خواہ کتنے ہی کچرے میں ہو' کوئی اسے چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ جب میں کچرا گھر میں پہنچا تو وہاں لوگوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ صرف مرد ہی مرد نظر آ رہے تھے اگر ایک عورت گناہ کرتی ہے تو دوسری عورتیں بھیڑ نہیں لگاتیں۔ شرم انہیں روکتی ہے۔ مردوں کو شرم کبھی نہیں روکتی۔ وہ لوگ پوچھنے آئے تھے کہ وہ بچی کس کی ہے۔ میں نے کہا۔

"اگر مجھے معلوم ہوتا تو یہ بچی اسی کی گود میں نظر آتی۔ میں کیا بتاؤں کہ یہ آپ لوگوں میں سے کس کی ہے؟"

یہ بات سن کر لوگوں کے منہ بن گئے۔ میں نے کہا۔

"برا ماننے کی بات نہیں ہے۔ یہ انسان کی بچی ہے اور آپ سب انسان ہیں۔ اس

www.pklibrary.net

رشتے سے کہتا ہوں کہ یہ آپ کی نہیں ہے تو آپ کے کسی بھائی کی ہے۔ اسے آپ اس کے ماں باپ تک نہیں پہنچا سکتے۔ اگر یہ پہنچ سکتی تو اسے یہاں پہنچانے والے چھوڑ کرنہ جاتے۔ اب تو ہمدردی اور محبت والی بات ہے۔ کسی کے دل میں انسانیت کا درد ہے تو آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھالے۔

میری بات سن کر ایک صاحب لاحول پڑھتے چلے گئے۔ کسی نے ہمدردی سے کہا۔ "بیچاری!" کہیں سے آواز آئی۔ "غلاظت کی پوٹ کو کون ہاتھ لگائے گا؟"

کسی نے پیش گوئی کی "قیامت قریب ہے۔"

اور قیامت اس طرح سے قریب تھی کہ ایک وہی بھلے اور چاٹ والا مین روڈ کے گاہک چھوڑ کر اپنی بارہ مسالے کی گاڑی کچرا گھر کی طرف لے آیا تھا۔ ایک مونگ پھلی والا آوازیں لگا رہا تھا۔ دو لڑکے ادھر سے ادھر گھومتے پھرتے پان اور سگریٹ فروخت کر رہے تھے۔ ایک بوڑھے نے چائے کی چلتی پھرتی دکان کھول لی تھی۔ لوگ خرید رہے تھے کھا رہے تھے پی رہے تھے اور قیامت کی پیش گوئیاں کر رہے تھے۔

شام تک بڑی چہل پہل رہی۔ لوگ آتے رہے اور جاتے رہے۔ پھر پولیس والے آگئے۔ ان کے ساتھ بہت سے پریس رپوٹرز اور فوٹو گرافرز تھے۔ میں فوراً ہی بچی کو کچرے میں لٹا کر کچرا گھر کے اندر آیا۔ وہاں آئینے کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی بھی تھی۔ میں اپنے بال سنوارنے لگا۔ اور کوٹ کی آستین سے چہرے کو رگڑ رگڑ کر پونچھنے لگا۔ بڑی مدت کے بعد کچھ لوگ میری اور میرے کچرا گھر کی تصویریں اتارنے آئے تھے۔ جب میں اچھی طرح تیار ہونے کے بعد بچی کے پاس آیا تو ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"تم نے کس وقت اس بچی کو یہاں پایا تھا؟"

میں نے جواب دیا۔ "جناب! آدھی رات کے بعد میں نے اس معصوم کے چیخنے کی آواز سنی۔ اس کچرا گھر سے باہر جھانک کر دیکھا تو ایک گاڑی گھومتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس وقت بچی زور زور سے رو رہی تھی۔ میں اسے اٹھا کر چیخنے لگا آوازیں دینے لگا لیکن وہ سنگدل میری آواز کی پہنچ سے دور چلے گئے تھے۔"

یہ کہہ کر میں نے بچی کو گود میں اٹھالیا پھر مسکراتے ہوئے پوز بنا کر کہا۔

www.pklibrary.net

"ہاں تو جناب! میں تیار ہوں۔ آپ تصویریں اتاریں......"

فوٹوگرافر نے کہا۔ "ہم تصویریں اتار چکے ہیں۔"

میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"لیکن میں تو ابھی آیا ہوں۔ ابھی میں نے بچی کو گود میں لیا ہے۔ اب آپ تصویریں اتاریں۔"

میری باتیں سن کر سب ہنسنے لگے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہمارا سبجیکٹ یہ نوزائیدہ بچی ہے' تم نہیں ہو۔ جو ہمارا موضوع ہے' ہم اس کی تصویریں لے چکے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جناب! میں بھی سبجیکٹ ہوں بلکہ بہت بڑا سبجکٹ ہوں۔ ایسے وقت جب کہ لوگ اس بچی کو ہاتھ لگانا پسند نہیں کر رہے ہیں' اسے گناہ کی پوٹ سمجھ رہے ہیں' یہ انسان ہے اور لوگ اسے انسان نہیں سمجھ رہے' میں اسے اٹھا کر کلیجے سے لگائے ہوئے ہوں' رات سے اب تک اس کی حفاظت کر رہا ہوں' ایک باپ کی طرح' ایک ماں کی طرح' ایسے ماں باپ کی طرح نہیں جو اسے جنم دینے کے بعد ایک سبجیکٹ بنا کر چھوڑ گئے ہیں۔ اگر میں نہ ہوتا تو پچھلی رات آپ کا یہ سبجیکٹ سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتا۔"

انہیں توقع نہیں تھی کہ مجھ جیسا کوڑا کرکٹ کے ڈھیر میں رہنے والا بوڑھا ایسی متانت اور ذہانت سے بول سکتا ہے۔ وہ مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے اور میری باتوں کو نوٹ کر رہے تھے پھر ایک نے پوچھا۔

"تمہاری گفتگو کے پیچھے ایک اچھی تعلیم بول رہی ہے۔ کیا تم تعلیم یافتہ ہو؟ کون ہو تم؟"

"میں آپ کی طرح انسان ہوں۔ اور اس ننھی بچی کی طرح اس دنیا کا ایک فالتو سامان ہوں۔ دس برس پہلے حالات نے مجھے اس کچرا گھر میں پھینک دیا تھا۔ اس وقت میں پچپن برس کا تھا' اب میں پینسٹھ برس کا ہوں۔ اس وقت میں نظام الدین ایم اے آنرز کہلاتا تھا اور اردو لٹریچر کا معلم تھا۔ اب میں نظام بابا کہلاتا ہوں اور اس کچرا گھر میں ایک طالب علم کی طرح کچرے کی زبان پڑھ رہا ہوں۔"

کچھ دیر پہلے وہ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ اب حیرانی سے منہ کھولے مجھے دیکھ رہے تھے

www.pklibrary.net

اور بڑی بے یقینی سے کہہ رہے تھے۔
"تم ایم اے آنرز ہو؟ نہیں......."
"تم اردو لٹریچر کے استاد تھے؟ نہیں......."
"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تمہارے جیسا قابل آدمی یہاں کیسے آ سکتا ہے؟"
"کیسے نہیں آ سکتا۔" میں نے کچرے میں سے ایک ٹوٹی ہوئی، پچکی ہوئی گڑیا کو اٹھا کر کہا۔ "یہ کیسے آ گئی؟ جب یہ گڑیا مکمل تھی تو کسی صاف ستھرے گھر میں کسی بچی کی گود میں رہتی تھی۔ پھر یہ پرانی ہو گئی اور ٹوٹنے لگی، پچکنے لگی تو نئی گڑیا خرید کر اسے پھینک دیا گیا۔ وہ دیکھو، وہ جو ٹوٹی ہوئی بوتل ہے، اس میں دوا آئی تھی۔ اس بوتل کا منہ دعا کی طرح کھلتا تھا اور بیماروں کو شفا دیتا تھا۔ جب شراب پر پابندی عائد ہوئی تو ایک شرابی نے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے دوا کا لیبل رہنے دیا اور اس کے پیٹ میں شراب بھر دی۔ پھر اس بوتل کا منہ گالیوں کی طرح کھلنے لگا۔ ایک رات وہ یہاں پیتے ہوئے گزر رہا تھا۔ جب یہ بوتل خالی ہو گئی تو اس نے بوتل کو ایک گندی سی گالی دی پھر کچرا گھر کی دیوار پر اسے زور سے دے مارا۔ یہ ٹوٹ گئی۔ یہ جو بیماریوں سے ٹوٹنے والوں کو جوڑتی تھی، اسے ریزہ ریزہ کر دیا گیا۔
مجھ سے یہ نہ پوچھو کہ میں تعلیم کی ایک ایک خوراک دوا دینے والا معلم کس طرح ٹوٹ پھوٹ کر یہاں آ گیا۔ یہاں تمام ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے پیچھے انسان کی کتنی ہی نازیبا حرکتیں، خود غرضیاں اور مکاریاں چھپی ہوئی ہیں۔ میں صرف اتنا ہی کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ انسان کو جو چیز ناپسند ہوتی ہے، اسے وہ کچرے میں پھینک دیتا ہے۔ خواہ دودھ کی بوتل ہو، گود کا بچہ ہو، یا پرانی نسل کا بوڑھا۔"
وہ لوگ میری باتوں کو لکھتے جا رہے تھے۔ مجھے اپنی اور کچرا گھر کی تصویریں اتروانے کا شوق نہیں تھا مگر میرے دل کی گہرائیوں سے جو باتیں نکل رہی تھیں، ان سے میرے ماضی کا زخم ہرا ہو گیا۔ میرا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ ان لوگوں نے مجھ سے کتنے ہی سوالات کئے۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ انہوں نے مختلف زاویوں سے تصویریں دوبارہ اتاریں پھر خاموشی سے بے زار ہو کر چلے گئے۔
رات آئی لوگوں کی بھیڑ چھٹ گئی۔ اس رات میں نے کچھ نہیں کھایا۔ میرا دل

www.pklibrary.net

بھاری ہو رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ ماضی کے کچرے میں جھانک کر خوب آنسو بہاؤں لیکن اس نوزائیدہ بچی کی وجہ سے آنسو بہانے کی بھی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس بچی کی کہانی تجسس اور اسرار لئے کتنی دور تک جائے گی۔ کچرا گھر کے آس پاس سناٹا ہو جانے کے بعد یہی سوچا جا سکتا تھا کہ اب صبح تک کوئی پریشان کرنے نہیں آئے گا۔ لیکن یہ تو رات ہی کا وقت ہوتا ہے جب گناہ گار منہ چھپا کر نکلتے ہیں۔

آدھی رات ادھر تھی اور آدھی رات ادھر، تب میں نے ماضی کا دریچہ کھولنا چاہا۔ اسی وقت بچی رونے لگی۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ پتہ نہیں نوزائیدہ بچے دن رات میں کتنی بار شہد چاٹنا چاہتے ہیں۔ میں نے پھر شہد میں انگلی ڈبو کر اس کے منہ میں ڈال دی۔ وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہوئی۔ دوسرے لمحے پھر رونے لگی۔ میں نے اس کے منہ میں کچھ اور شہد ٹپکایا پھر بھی وہ خاموش نہ ہوئی۔ میں اسے اٹھا کر ٹہلانے لگا۔ اسے سمجھانے اور منانے لگا۔ جانے وہ کس ضدی باپ کی بیٹی تھی، چپ ہونا ہی نہیں جانتی تھی۔ رات کی تاریکی اور خاموشی میں چیخ چیخ کر اپنوں کو پکار رہی تھی۔ اور اپنوں کی پکار پر اپنے ضرور آتے ہیں۔ میں نے دیکھا، کچرا گھر سے ذرا فاصلے پر وہ چادر میں منہ چھپائے کھڑی تھی۔ اور بار بار ادھر ادھر سر گھما کر سہمے ہوئے انداز میں دیکھ رہی تھی کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے؟

میں فوراً ہی سمجھ گیا کہ یہ شازیہ ہی ہو سکتی ہے۔ وہی شازیہ جس پر بانو کا شوہر عاشق تھا اور ان دونوں کے عشق کے انجام پر وہ بچی رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

وہ آگے بڑھی ذرا لڑکھڑائی پھر میرے پاس پہنچ کر سردی یا پھر خوف سے کانپتے ہوئے بولی۔

"بچی کو مجھے دو۔ میں اسے چپ کرانے کے بعد لے آؤں گی۔"

"کیا یہ بچی تمہاری ہے؟"

"نہیں، میری نہیں ہے۔ دیر نہ کرو۔ مجھے دو۔"

"تمہاری نہیں ہے تو تمہیں کیوں دوں۔ تم اسے کہاں لے جا کر چپ کراؤ گی۔"

www.pklibrary.net

"میں اسے اپنے گھر لے جاؤں گی۔ دیکھو بحث نہ کرو' کوئی آجائے گا۔"

"تھانیدار صاحب نے کہا ہے کہ جو بچی کو لینے آئے میں اسے تھانے لے آؤں۔ تم تھانے چلو گی؟"

وہ منہ پھیر کر جانے لگی۔ میں نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔

کیا اسے چپ نہیں کراؤ گی؟ ڈرتی بھی ہو اور بچی کے لئے مرتی بھی ہو۔ یہ کیسی محبت ہے؟"

وہ خاموشی سے چلتی رہی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے تھے تاکہ بچی کے رونے کی آواز سنائی نہ دے۔ مگر کوکھ سے اٹھنے والی چیخیں ماں کے کلیجے میں چبھ رہی تھیں۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر بچی کو مجھ سے چھین لیا پھر وہیں سڑک کے کنارے دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔ میں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ چند لمحے بعد ہی بچی چپ ہو گئی لیکن بالکل ہی خاموشی نہیں ہوئی تھی۔ اب ماں کی سسکیاں اور آہیں سنائی دے رہی تھیں۔

یہ ہماری دنیا میں کیا ہوتا ہے بچے چپ ہو جاتے ہیں تو مائیں رونے لگتی ہیں۔ چشمہ بہتا ہے تو اس کی لہروں سے ترنم پھوٹتا ہے۔ ماں کی چھاتیوں سے دودھ بہتا ہے تو آہوں کے سر جاگتے ہیں۔ میں نے پوچھا۔

"جب اپنی تخلیق کو مٹانا ہی تھا تو اسے جنم کیوں دیا؟ اور جب مٹانے کے لئے چھوڑ ہی دیا تھا تو اسے دودھ پلانے کیوں آگئیں؟"

وہ آہستگی سے بولی۔ "تم غلط سمجھ رہے ہو۔ یہ بچی میری نہیں ہے۔"

"تم غلط کہہ رہی ہو۔ یہ بچی تمہاری ہی ہے اور تمہارا نام شازیہ ہے۔ یہاں فلیٹ نمبر ایف اکیاسی (F-81) میں بانو نام کی ایک عورت رہتی ہے۔ اس کے شوہر سے تمہارے ناجائز تعلقات رہے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ غصے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "میں کسی بانو اور اس کے شوہر کو نہیں جانتی۔ پتہ نہیں تم کس شازیہ کی بات کر رہے ہو۔ میرا نام شازیہ نہیں ہے۔ میں نے کسی ناجائز بچے کو جنم نہیں دیا۔ میں ایک بیاہتا عورت ہوں۔"

"بہت خوب! بیاہتا ہو۔ اب میں آگے سوال کروں گا تو تم جواب میں کہو گی کہ تمہارا

www.pklibrary.net
شوہر اور تمہارا بچہ گھر میں ہیں۔ تم ممتا سے مجبور ہو کر یا انسانی ہمدردی کے تحت ایک لاوارث بچی کو دودھ پلانے آئی ہو۔"

"یقین کرو' یہی بات ہے۔ میں صبح سے بچی کے بارے میں سوچ رہی تھی اور تڑپ رہی تھی کہ پتہ نہیں کس ماں نے اپنے جگر کا ٹکڑا پھینک دیا ہے۔ ابھی میں سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر نیند نہیں آ رہی تھی مجبوراً اپنے بچے کے حصے کا دودھ اسے پلانے آ گئی۔"

"دوسرے تمہاری بات کا یقین کر سکتے ہیں۔ میں نے تو کچرا گھر میں بیٹھ کر یہی دیکھا ہے کہ کوئی اپنے حصے کا کھانا دوسرے کو نہیں دیتا۔ بچ جائے تو پھینک دیتا ہے۔ اور ایسی ماں تو کہیں نہیں دیکھی جو اپنے بچے کے منہ سے دودھ چھڑا کر پرائے بچے کے منہ میں دے۔ مجھے سچ بتاؤ ورنہ بچی کو چھین کر لے جاؤں گا۔"

وہ خاموش رہی۔ شاید مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ میں نے کہا۔

"اگر تم گناہ گار نہیں ہو تو پولیس کا نام سن کر گھبرا کیوں گئیں؟"

"میں یہ بدنامی پسند نہیں کرتی کہ میں نے کسی لاوارث بچی کو دودھ پلایا ہے۔"

"یہ بدنامی نہیں بہت بڑی انسانیت ہے۔"

"دنیا والے انسانیت نہیں سمجھیں گے' وہ مجھے زبردستی بچی کی ماں بنا ڈالیں گے۔"

"کنیز! یہ کیا حماقت ہے۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ کہیں بچی کو چھپ کر دودھ پلا دینا مگر تم تو سڑک کے کنارے......."

کنیز نے جلدی سے بچی کو میری گود میں واپس کرتے ہوئے' آنے والے سے پوچھا۔

میرا بچہ کہاں ہے؟ آپ اسے کہاں چھوڑ آئے ہیں؟"

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کنیز کا شوہر ہے اور کنیز اس کا گریبان پکڑ کر اپنے بچے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس نے کہا۔

"اطمینان رکھو بچہ گھر میں سو رہا ہے۔ میں نے باہر سے تالا لگا دیا ہے۔"

"نہیں میرا بچہ لاوارث نہیں ہے کہ آپ اسے بے سہارا چھوڑ آئے ہیں۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو......."

www.pklibrary.net

اس کی آواز گھٹ گئی۔ شاید اس کے شوہر نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔
"آہستہ بولو۔ رات کے وقت آواز دور تک جاتی ہے۔"
میری کمزور نگاہوں کے سامنے دو سائے جیسے ہاتھا پائی میں مصروف تھے۔ کنیز اپنے بچے کے لئے تڑپ رہی تھی۔ پھر وہ خود کو چھڑا کر بھاگنے لگی۔ مرد اس کے پیچھے دوڑا پھر رک گیا۔ اس نے واپس آکر مجھ سے پوچھا۔
"بچی کا پیٹ بھر گیا ہے نا؟ یہ سو گئی ہے نا؟ ہاں آواز تو نہیں آ رہی ہے۔ دیکھو اس کی اچھی طرح حفاظت کرنا۔ سردی سے بچا کر رکھنا۔ اس کے ساتھ جو پانچ ہزار روپے رکھے گئے تھے' اس کا حساب میں بعد میں آکر کروں گا۔"
یہ کہتے ہی وہ بھی اپنی بیوی کے پیچھے بھاگتا چلا گیا۔ ان دونوں کے جاتے ہی پھر وہی سناٹا چھا گیا کچھ دیر پہلے جو کردار سامنے آئے تھے وہ تاریکی میں گم ہو چکے تھے۔ لوگوں کو دن کے اجالے میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا پھر بھلا رات کی تاریکی میں اتنی جلدی یہ حقیقت کیسے واضح ہو جاتی کہ وہ دونوں میاں بیوی کون تھے؟ اور گھر میں جائز بچہ رکھ کر ناجائز بچے کو دودھ پلانے کیوں آئے تھے؟
میں اس ننھی سی جان کو سینے سے لگا کر کمرا گھر میں واپس آگیا۔ اسے مسکتی سیج پر لٹا کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ باہر اندھیرے میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا کہ شاید پھر کوئی آجائے۔
کوئی اور تو نہیں آیا۔ باہر کی تاریکی میں' میں خود ہی نظر آیا۔ میں بہت ہی صاف ستھرے لباس میں تھا۔ میری عمر پینتیس برس تھی۔ سردی کی راتوں میں لوگ لحافوں میں دبک کر اپنی کسی محبوبہ کو یاد کرتے ہیں یا فحش کتابیں پڑھتے ہیں۔ میں لحاف اوڑھے نفسیات کی خشک کتاب پڑھ رہا تھا۔ میری شفیق ماں دودھ کا گلاس لے کر میرے کمرے میں آئی اور کہنے لگی۔
"بیٹے! اب شادی کرلو۔ بیوی آئے گی تو اتنی رات تک جاگ جاگ کر تمہاری خدمت کرے گی۔" میں نے کتاب کا ایک ورق الٹتے ہوئے کہا۔
"امی! میں کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مجھے شادی بیاہ سے دلچسپی نہیں ہے۔ میری دلچسپی کا مرکز صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک تو کتابیں اور دوسرے اسکول کے بچے۔ میں ان معصوم

www.pklibrary.net

پوری دنیا میں اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"
"بیٹے! جب اپنی بیوی آئے گی اور اپنے بچے ہوں گے تو پھر تمہارے یہ خیالات نہیں ہوں گے۔ اپنے بچوں کے سامنے تم دوسرے بچوں کو بھول جاؤ گے۔"
"یہی تو بڑی برائی ہے کہ ہم اپنے بچوں کے آگے دوسرے بچوں کی خوب صورتی کو' ان کے معصوم جذبات کو اور ان کی اہمیت کو فراموش کر دیتے ہیں۔ امی! میں کسی کو خاص طور سے اپنا نہیں بناؤں گا تو مجھ میں خود غرضی نہیں ہوگی۔ تب ساری دنیا کے بچے میرے اپنے ہوں گے۔ بلکہ اپنے ہیں۔ آپ مجھے صرف ایک بیوی اور چند بچوں تک محدود نہ کریں۔"
میری امی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔ جب تک وہ زندہ رہیں' مجھ سے بحث میں شکست کھاتی رہیں لیکن مرتے وقت انہوں نے یہ کہہ کر مجھے شکست دے دی کہ میں جب تک شادی نہیں کروں گا' ان کی روح بے قرار رہے گی۔ ان کی وفات کے ایک سال بعد میں نے شادی کر لی۔ ناہید میری دلہن بن کر آئی تو پتہ چلا کہ زندگی کا دوسرا رخ کتنا حسین اور رنگین ہے۔
میں نے اسکول سے کبھی چھٹی نہیں لی۔ اکثر بیمار ہونے کے باوجود بچوں کو پڑھانے جاتا تھا۔ ناہید کی قربت میں پہلی بار دل میں یہ خیال آیا کہ مجھے کچھ روز اسکول سے چھٹی لے کر ناہید کی زلفوں کے سائے میں وقت گزارنا چاہئے۔ میری راتیں کتابیں پڑھتے گزرتی تھیں۔ شادی کی پہلی رات اپنی شریک حیات کو پڑھتے گزر گئی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے' پھولوں کی سیج مہک رہی تھی۔ ناہید کے بدن سے حنا کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ایسے وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں نے پیار سے کہا۔
"ناہید! تمہارے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر جا کر دیکھنا ہی ہوگا۔ میرا کوئی ضرورت مند شاگرد ہوگا۔"
شادی کی پہلی رات عورت گونگی ہوتی ہے۔ اسے کوئی بات ناگوار گزرے' تب بھی وہ ذرا صبر کر لیتی ہے۔ میں وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ دوسرے کمرے کا دروازہ کھولنے کے بعد ایک نوجوان نظر آیا۔ وہ میرا شاگرد نہیں تھا۔ کوئی اجنبی لڑکا تھا۔ اس نے مجھے سلام کرتے ہوئے کہا۔

www.pklibrary.net

"سر! میں فرسٹ ایر کا طالب علم ہوں۔ آج مجھے کیمسٹری کا پرچہ حل کرنا ہے۔ میری کتاب کا ایک ورق پھٹ کر کہیں گم ہوگیا ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اگر آپ ہائیڈروجن کے چند خواص بتادیں۔"

میں نے کہا۔ "اندر آجاؤ۔ ایک سپاہی اپنی جان سے زیادہ اپنی تلوار کی حفاظت کرتا ہے۔ کیونکہ وہی تلوار اس کی جان بچاتی ہے۔ ایک طالب علم دل سے اپنی کتابوں کی حفاظت کرتا ہے کیونکہ وہی کتابیں اسے انسان بناتی ہیں۔ مجھ سے کچھ پوچھنے اور سیکھنے سے پہلے وعدہ کرو کہ آئندہ اپنی جان سے زیادہ کتابوں کو عزیز رکھو گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔" وہ اندر آکر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا "برخوردار! انسانوں کی فرداً فرداً ایک کمزوری ضرور ہوتی ہے۔ مگر ہماری اجتماعی اور قومی کمزوری یہ ہے کہ ہم نے رسولؐ خدا کی دی ہوئی کتاب ایک نادان طالب علم کی طرح گم کردی ہے۔ یاد رکھو جو شخص یا جو اہل مذہب اپنی بنیادی کتاب کھودیتے ہیں یا فراموش کردیتے ہیں' وہ سوال بن کر دوسروں سے پوچھتے پھرتے ہیں اور دوسروں کے طور طریقوں پر چل پڑتے ہیں۔"

"ہاں تو تم ہائیڈروجن کے خواص معلوم کرنے آئے ہو۔ چلو نوٹ کرو۔ ہائیڈروجن گیس بے رنگ' بے بو اور بے ذائقہ ہوتی ہے۔ دنیا میں سب سے ہلکی گیس اور وزن کے لحاظ سے ہوا کا چوتھائی حصہ ہے۔ چونکہ یہ پانی میں بہت مشکل سے حل ہوتی ہے۔ اس لئے پانی پر اس گیس کا ذخیرہ کیا جاسکتا ہے اور ٹھنڈک اور دباؤ کے زیر اثر اسے مائع اور ٹھوس حالت میں لایا جاسکتا ہے۔"

وہ لکھتا جا رہا تھا۔ میں بولتا جا رہا تھا۔ جب میں علم کے خزانے کو اپنے سینے سے بچوں کے سینے میں منتقل کرتا ہوں تو ایسے وقت ساری دنیا کو اور سارے رشتوں کو بھول جاتا ہوں۔ میں بچوں کے عالمی سال میں اپنی طرف سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ ہم خود غرضی کو' کینہ پروری کو اور اپنے پرائے کی تعریف کو بھول کر ہی بچوں کو ایک صحت مند دنیا تحفے کے طور پر دے سکتے ہیں۔

دو دنوں تک ناہید چپ چاپ تماشہ دیکھتی رہی پھر بچوں کے خلاف بولنے لگی۔ کیونکہ پڑھنے والے بچے جوانی کے دن اور امنگوں کی آدھی آدھی راتیں مجھ سے لے

www.pklibrary.net

لیتے تھے۔ دن کو میں اسکول چلا جاتا تھا اور رات گئے تک پڑوس کے بچے کبھی پڑھنے اور کبھی پوچھنے چلے آتے تھے۔ ایک ہفتے کے اندر ہی ناہید پھٹ پڑی۔

"یہ گھر ہے اسکول نہیں ہے۔ آپ بچوں کو یہاں آنے سے منع کردیں۔"

"ناہید! یہ گھر اور اسکول کی بات نہیں ہے۔ نماز اور کتاب کہیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ آخر تم ناراض کیوں ہوتی ہو؟ آدھی رات کے بعد سے صبح تک تمہارا ہی ہوتا ہوں۔"

آدھی رات کے بعد الو جاگتے ہیں۔ میں جاگ کر محبت نہیں کر سکتی۔ آپ کی زندگی بچوں کے ساتھ گزر رہی تھی پھر مجھے اس جہنم میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تعجب ہے۔ تم بچوں کی پیار بھری دنیا کو جہنم کہہ رہی ہو۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں ساری عمر تمہاری عزت کرتا رہوں تو تم بچوں کی قدر کرو۔ تم بھی انہیں کچھ نہ کچھ سکھایا پڑھایا کرو۔"

"لیکن ناہید نے مجھ سے تعاون نہیں کیا۔ ایک ماہ بعد میں نے رفتہ رفتہ یہ دیکھا کہ بچے میرے دروازے پر کچھ پوچھنے اور سیکھنے نہیں آتے ہیں۔ بچوں کو میں نے فرداً فرداً پکڑ کر پوچھا۔ "بھئی میرے گھر کیوں نہیں آتے ہو؟"

جواب ملا "ماسٹرنی صاحبہ غصہ کرتی ہیں" میرے تمام شاگرد ناہید کو ماسٹرنی صاحبہ کہتے تھے۔ میں نے پہلی بار ناہید کو غصہ دکھایا۔ اس نے بھی پہلی بار غصے سے کہا۔

"آپ مجھے بھگا کر نہیں لائے ہیں۔ باقاعدہ نکاح پڑھا کر اپنا گھر بسانے کے لئے یہاں لائے ہیں یہ میرا گھر ہے۔ میری مرضی کے بغیر آپ کے وہ کیڑے مکوڑے یہاں نہیں آئیں گے۔"

وہ چیخ چیخ کر بول رہی تھی۔ میں بے عزتی کے ڈر سے سہم گیا۔ محلے میں میری بڑی عزت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے گھر کی آواز باہر والے سنیں۔ میں نے کہا۔

"آہستہ بولو۔ یہاں سے اسکول تک میری عزت ہے۔ چھوٹے بڑے سب ہی مجھے ماسٹر صاحب کہہ کر سلام کرتے ہیں۔"

میرے بھائی جان کو تو شہر کے تمام دولت مند اور تمام پولیس افسران سلام کرتے ہیں۔ اگر وہ ڈی سی نہ ہوتے اور چار برس پہلے آپ کو اسکول میں ملازمت نہ دلواتے تو یہ

www.pklibrary.net

عزت کہاں سے ملتی؟ لوگ آپ کی قابلیت کی وجہ سے نہیں، میرے بھائی جان کی وجہ سے سلام کرتے ہیں۔"

وہ اس شہر کے ڈی سی طفیل احمد کی سگی بہن نہیں تھی۔ اگر سگی ہوتی تو اتنا بڑا سرکاری افسر ایک غریب اسکول ماسٹر کو اپنا بہنوئی نہ بناتا۔ ناہید سے بہت دور کا رشتہ تھا۔ چونکہ وہ ایک بڑا افسر تھا اس لئے ناہید اسے بھائی جان کہنے میں فخر محسوس کرتی تھی۔ میں نے کہا۔

"مجھے تمہارے بھائی جان کی سفارش سے نہیں، اپنی صلاحیتوں کے باعث اسکول کی ملازمت ملی ہے۔ چار برس سے اسکول میں میرا ریکارڈ رہا ہے کہ میں نے کسی کے نااہل بچے کو امتحان میں پاس کرنے کے لئے نہ تو بڑے لوگوں کی سفارش پر توجہ دی ہے اور نہ ہی کبھی رشوت قبول کی ہے۔ ایمان کی تعلیم دینے کے لئے سب سے پہلے معلم کو ایماندار بننا چاہئے۔ یہ میرے معبود کا کرم ہے کہ میں اب تک صاحب عزت ہوں اور آئندہ بھی رہوں گا۔"

ناہید نے اس وقت میری بات کا جواب نہیں دیا۔ "اونہہ" کہہ کر باورچی خانے میں چلی گئی جب وہ رات کو سونے کے لئے آئی تو اس کا غصہ ڈھل چکا تھا۔ وہ میری آغوش میں پیار محبت کی باتیں کرتی رہی۔ پھر اس نے مہنگائی کی بات چھیڑی۔ پھر یہ ثابت کیا کہ میری تنخواہ میں اچھی طرح گزارا نہیں ہوگا۔ میں نے پوچھا۔

"تو پھر کیا کیا جاسکتا ہے؟ دوسرے ٹیچرز اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد بچوں کو ٹیوشن پڑھاتے ہیں اور اضافی آمدنی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب پڑھانے کے عوض اسکول سے تنخواہ مل جاتی ہے تو پھر مجھے فاضل وقت میں بچوں کو مفت سمجھانا پڑھانا چاہئے۔ کتابیں کاپیاں مہنگی ہیں۔ تعلیم کے اخراجات اتنے زیادہ ہیں کہ بچوں سے مزید رقم لینا ظلم ہے۔"

"سارے جہاں کے لوگ جتنا کماتے ہیں، اس سے کچھ اور زیادہ کمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اچھی زندگی گزارنے کے لئے، اچھا کھانے اور پہننے کے لئے اور گھر میں اچھا آرائشی سامان رکھنے کے لئے انسان کو زیادہ کمانا ہی پڑتا ہے۔ اگر میرے میکے سے میرے ملنے والے آئیں تو انہیں گھر میں کیا دکھاؤں گی؟ ایک ریڈیو تک نہیں ہے۔ بیٹھنے

www.pklibrary.net

کے لئے باوا آدم کے زمانے کی کرسیاں ہیں۔ اگر مہنگا نہیں تو کم از کم سستا سا صوفہ تو ہونا چاہئے۔ آپ کو ٹیوشن کی فیس لینی چاہئے۔"

"ناہید میرے کچھ اصول ہیں اور مجھے فخر ہے کہ میرے ان اصولوں سے نادار، یتیم اور غریب بچوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ جو بے چارے بھاری فیس ادا نہیں کر سکتے، وہ میرے پاس آتے ہیں۔ کچھ پوچھتے ہیں، کچھ سیکھتے ہیں۔ میں ان سیکھنے والوں کے ساتھ کاروباری انداز اختیار نہیں کر سکتا۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہی۔ سوچتی رہی پھر بولی۔

"اچھی بات ہے۔ میں آپ کے اصولوں سے اختلاف نہیں کروں گی مگر آپ میری ایک بات مان لیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کہو کیا بات ہے؟"

آپ کل ہی ڈی سی کے نام درخواست لکھئے کہ آپ ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر ترقی پانا چاہتے ہیں۔ آپ درخواست لکھ کر مجھے دیں۔ باقی میں نمٹ لوں گی۔"

"کیا نمٹ لوگی؟ تم کیا کرنا چاہتی ہو؟ ہوں۔ سمجھ گیا۔ تم اپنے ڈی سی بھائی جان کے سامنے میری درخواست پیش کروگی اور ان کے ذریعے مجھے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنوادوگی۔ دیکھو ناہید! نہ تو میں کسی کی سفارش سنتا ہوں اور نہ اپنے لئے کسی کی سفارش کا محتاج رہتا ہوں۔ پھر یہ کہ ہمارے اسکول میں ایک قابل ہیڈ ماسٹر موجود ہیں۔ میں کسی کا حق نہیں مارنا چاہتا۔"

وہ غصے سے الگ ہو گئی۔ چڑ کر بولی۔

"پھر آپ زندگی میں کیا کریں گے؟ یوں تو کتے بلیوں کا بھی پیٹ بھر جاتا ہے۔ ہم صرف پیٹ بھرنے کے لئے زندہ نہیں ہیں۔ سوسائٹی میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا اور اونچی سطح پر زندگی گزارنا آپ کو اچھا کیوں نہیں لگتا؟"

میں نے جواب نہیں دیا۔ اپنی روٹھی ہوئی شریک حیات کو نہیں منایا۔ کیونکہ منانے کا مطلب یہی ہوتا کہ میں اس کی غلط باتوں کو تسلیم کر رہا ہوں۔ اگر میں اس سے التجا کرتا کہ مجھے اپنے اصولوں پر چلنے دو اور میری آمدنی کے مطابق گزارا کرو تو پھر عورتوں کی نظروں میں اسے منانا نہیں کہتے۔ وہ کبھی نہ مانتی۔ اس لئے ہم دونوں ایک دوسرے

www.pklibrary.net

سے منہ پھیر کر خاموش پڑے رہے۔ پھر میری آنکھ لگ گئی۔

دو دن بعد میرے سسر صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے آرام سے بیٹھ کر مجھے دنیا کی اونچ نیچ سمجھائی۔ مثالیں دیں کہ لوگ کس طرح ایکسٹرا آمدنی کے ذریعے کوٹھیاں بنوا لیتے ہیں۔ اگر میں غریب بچوں سے فیس لینا پسند نہیں کرتا تو نہ سہی۔ مجھے کم از کم اپنی قابلیت کے مطابق ترقی تو کرنی چاہیے۔ میں ایم اے آنرز ہوں اور آسانی سے ایک اسکول کا ہیڈ ماسٹر بن سکتا ہوں۔ اگر میں ان کی بات مان جاؤں تو میرا عہدہ بھی بڑھے گا تنخواہ بھی بڑھے گی۔ اور زندگی کی دوسری سہولتیں بھی میسر ہوں گی۔ ان کی بیٹی گھٹ گھٹ کر زندگی نہیں گزارے گی۔

میں نے ان کے سامنے بھی صاف صاف کہہ دیا۔ "میں ہیڈ ماسٹر نہیں بنوں گا۔"

ایک ہفتے بعد ڈی سی طفیل احمد نے مجھے اپنی کوٹھی میں طلب کیا۔ چونکہ دور کی رشتے داری تھی اس لئے مجھے ایک پیالی چائے پلائی۔ چائے پلانے کے دوران انہوں نے پوچھا۔

"کیوں مسٹر! تم ہیڈ ماسٹر کیوں نہیں بننا چاہتے؟"

مجھے ان کے انداز تخاطب سے دکھ پہنچا۔ وہ مجھے تم کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ بیشک وہ ایک بڑے افسر تھے لیکن میں ایک باعزت انسان ہوں۔ میں اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ جو آئندہ نسل کو تعلیم دیتا ہے۔ بچوں کو صحیح طور پر انسان بنانے کے اصولوں پر عمل کرتا ہے۔ اس سے زیادہ اعلیٰ اور افضل کوئی نہیں ہو سکتا۔ مجھے دولت کی ہوس نہیں ہے۔ میں اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر نہیں کرتا کسی عالیشان کوٹھی میں نہیں رہنا چاہتا۔ جو مل جائے، صبر و شکر سے گزارا کر لیتا ہوں لیکن ایک چیز ضرور چاہتا ہوں اور وہ ہے عزت۔ میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ میری عزت کریں۔ میرا نام کریں کہ میں سچ مچ ایک ذمے دار معلم ہوں۔ ساری دنیا کے بچوں کو سمجھاتا ہوں کہ علم کی سند حاصل کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ کرشن چندر کا گدھا بھی وائس چانسلر بن سکتا ہے۔ اصل مقصد علم کو سمجھ کر حاصل کرنا ہے۔

جب میں اتنی اچھی باتیں سمجھاتا ہوں تو اس تعلیم کے عوض قابل عزت ہونے کا حقدار کہلا سکتا ہوں۔ کوئی مجھے تخت پر نہ بٹھائے، اپنے سامنے تختے پر ہی بٹھائے لیکن

www.pklibrary.net

آپ کہہ کر تو مخاطب کرے۔
انہوں نے اپنی بات کا جواب نہ پا کر مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔
"کیا تم اونچا سنتے ہو؟ ابھی میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔"
میں نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔
"جناب! میرا مقصد صرف بچوں کو پڑھانا ہے۔ اگر میں ہیڈ ماسٹر بن گیا تو اسکول کے دفتری کاموں میں الجھ کر رہ جاؤں گا۔ میرا تعلق صرف اسکول ماسٹروں سے رہے گا۔ کبھی کوئی ماسٹر غیر حاضر ہوا تو اس کی جگہ کلاس لینے کا موقع ملے گا۔ جبکہ میں اسکول کا تمام وقت بچوں کو پڑھاتے ہوئے گزارنا چاہتا ہوں۔ اس طرح جو مجھے روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے' وہ ہیڈ ماسٹر بن جانے سے حاصل نہیں ہوگی۔"
"تم انتہائی احمق انسان ہو۔ لوگ میری خوشامدیں کرتے ہیں اور تم...."
ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اپنی توہین سے لرزتے ہوئے کہا۔
"آ.... آپ کیا اپنے سامنے کسی کو انسان نہیں سمجھتے؟ بے شک آپ بہت بڑے افسر ہیں لیکن میں بھی اسکول ماسٹر ہوں۔ آپ مجھے آپ کہہ کر مخاطب نہیں کر سکتے۔ کوئی بات نہیں مگر میرے لئے احمق جیسے الفاظ تو استعمال نہ کریں۔ اگر میں احمق ہوں تو آپ ہی بتائیں کہ میں اپنی قوم کے بچوں کو کیا بنا رہا ہوں؟"
انہوں نے غصے سے چیخ کر ملازم کو آواز دی۔ ملازم دوڑتا ہوا آیا تو انہوں نے کہا۔
"اس ماسٹر کو دھکے دے کر یہاں سے باہر نکال دو۔"
یہ کہہ کر وہ غصے میں پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے۔ بیچارے ملازم نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا لیکن ان کا اتنا کہنا ہی کافی تھا کہ مجھے دھکے دے کر نکال دیا جائے۔ میں بوجھل قدموں سے چلتا ہوا عالیشان کوٹھی سے باہر آ گیا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میں کس طرح اندر ہی اندر توہین کے احساس سے مرا جا رہا تھا۔ میں بڑے سے بڑا صدمہ سہ سکتا ہوں۔ مگر اپنی بے عزتی کا دکھ برداشت نہیں کر سکتا۔
اس وقت اپنی حالت زار پر قہقہے لگانے کو جی چاہ رہا تھا۔ مگر میں اس جنونی خواہش کو بڑی مشکلوں سے دبا رہا تھا۔ کیونکہ صدمات سے ٹوٹ کر قہقہے لگانے والے پاگل کہلاتے

www.pklibrary.net

ہیں۔ میں گھر پہنچا تو ناہید میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"جو لوگ اپنی بیوی کی بات نہیں مانتے' بزرگوں کے مشوروں پر عمل نہیں کرتے' انہیں کم از کم اپنے حاکم کے سامنے جھکنا ہی پڑتا ہے۔ اب بتایئے۔ آخر آپ کو میرے بھائی جان کا حکم ماننا پڑا نا؟"

میں غصے سے بے قابو ہو رہا تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ناہید کو قتل کر دیتا۔ بچوں کی معصوم دنیا میں رہنے والا استاد خون خرابے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔ غصے کی حالت میں مجھ سے یہی ہو سکا کہ اپنی عادت کے مطابق ناہید کے کان پکڑ لیے۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنے کان چھڑاتے ہوئے بولی۔

"میں کوئی اسکول کی بچی نہیں ہوں کہ آپ کان پکڑ کر سزا دیں گے۔ آپ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

میں نے ناگواری سے جواب دیا۔

"میں نے تمہارے بھائی جان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا ہے۔"

ناہید کا چہرہ مرجھا گیا۔ تب میں بے اختیار قہقہے لگانے لگا۔ پہلے تو اپنی ہنسی خود میری سمجھ میں نہیں آئی پھر پتہ چلا کہ میں انتقاماً قہقہے لگا رہا ہوں کیونکہ میں نے ہیڈ ماسٹر نہ بن کر صرف ناہید کو ہی نہیں اس کے ڈی سی بھائی جان کو بھی اصولوں کے میدان میں شکست دی تھی۔ انہوں نے مجھے گھر سے نکال کر میری بے عزتی کی تھی۔ جواباً یہ ان کی بے عزتی تھی کہ جسے وہ معمولی ماسٹر سمجھ رہے تھے' اس نے ان کی پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔

میرا جواب سن کر اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔ دانت پیستے ہوئے مجھے دیکھا۔ پھر پاس رکھا ہوا ایک گلدان اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اس کے بعد چیخ کر بولی۔

"میں ابھی اور اسی وقت اپنے میکے چلی جاؤں گی۔ میرا آپ کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا...."

یہ کہہ کر وہ منمناتی ہوئی اپنا سامان سمیٹنے چلی گئی۔ میں جانتا تھا کہ ایسا ایک دن ضرور ہوگا۔ واقعی میرے ساتھ اس کا گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔ اب وہ میکے جا کر بیٹھنے والی تھی۔ میں نے اسے نہیں روکا۔ بعد میں' میں نے سوچا کہ اسے سمجھا منا کر روک لینا چاہئے تھا۔

www.pklibrary.net

میں ایک ہفتے تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ واپس نہیں آئی۔ محلے پڑوس کے لوگ میری گھروالی کو پوچھنے لگے۔ اس دنیا میں رہنے کے لئے اپنے پرائے سب ہی کے سوالوں کے جواب دینے پڑتے ہیں۔ ورنہ عزت نہیں رہتی۔ میں نے باتیں بنائیں کہ میرے سسر علیل ہیں۔ اس لئے بیوی کو وہاں چھوڑ دیا ہے۔

میں نے زندگی میں پہلی بار جھوٹ بولا تھا۔ میرا ضمیر ملامت کرنے لگا۔ جب استاد جھوٹا ہو تو شاگردوں کو سچا علم نہیں دے سکتا۔ میں ضمیر کی مار کھا کر ناہید کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ ایک ہی ہفتے میں پیلی پڑ گئی تھی۔ میری ساس یہ خوش خبری سنا کر چلی گئیں کہ میں باپ بننے والا ہوں۔

اچانک ہی میرا دل خوشیوں سے بھر گیا۔ میں نے چشم تصور میں دیکھا۔ بچہ میری گود میں کھیل رہا تھا۔ میں اسے سامنے بٹھا کر پڑھا رہا تھا۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلا رہا تھا۔ اسے انسان بنا رہا تھا۔ ناہید کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"بیٹھ جائیں۔ اب تو ہمارے اختلافات مٹ جانے چاہئیں۔"

میں اس کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

"اختلافات تم ہی ختم کرسکتی ہو۔ کیا اب بھی تم نہیں چاہو گی کہ ہمارا بیٹا ایماندار اور بااصول انسان کہلائے؟"

"ضرور چاہوں گی مگر یہ برداشت نہیں کروں گی کہ میرا بچہ پیدل اسکول جائے اور کار میں بیٹھنے والے بچوں کو دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا رہے۔ اگر آپ ابھی سے آمدنی نہیں بڑھائیں گے تو میں اپنے بچے پر آپ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔"

"دیکھو تم پھر جھگڑا بڑھانے والی باتیں کررہی ہو۔ کیا مجھے اپنے بچے کے مستقبل کی فکر نہیں ہوگی؟ میں اسے اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا۔ ایک سچا انسان بناؤں گا۔"

"جیسے آپ ہیں۔" وہ چڑ کر بولی۔ "میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ اب ناہید کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔ اب وہ صرف ضدی شریک حیات نہیں بلکہ میرے ہونے والے بچے کی ماں بھی تھی۔ اور اس بچے کو میری کمزوری بنا کر مجھ سے اپنی ضد منوا سکتی تھی۔ ہمارے درمیان پھر تو تو میں میں شروع ہوگئی۔ میرے ساس، سسر، سالے، سالیاں سب ہی جمع ہوگئے اور مجھے الزام دینے لگے۔ طعنے بھی دیئے

www.pklibrary.net

کہ جب مجھے درویشانہ زندگی گزارنی تھی تو میں نے شادی کر کے ناہید کی زندگی کیوں برباد کی؟

میں انہیں سمجھا نہیں سکتا تھا اور ان کی باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں اس لئے ناہید کے بغیر ہی گھر واپس آ گیا۔ اصول اپنی جگہ اٹل ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود جذبات پریشان کرتے ہیں۔ پہلے ناہید کے لئے پیار کا جذبہ تھا۔ اب ایک ننھے کی محبت کا اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے چند روز بڑی بے چینی میں گزرے پھر میں بچوں کو پڑھانے میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرنے لگا۔ تمام بچوں کے چہروں پر اپنے آنے والے بچے کی صورت دیکھ کر بہلنے لگا۔

اسی طرح وقت گزرنے لگا۔ نو ماہ بعد خوشخبری ملی کہ بیٹا پیدا ہوا ہے۔ میں پھر ناہید کے دروازے پر پہنچ گیا۔ میری ساس نے بچے کو میری گود میں لا کر رکھا۔ وہ ناہید کی طرح خوبصورت تھا مگر اس کے تیور میری طرح تھے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ میرے جسم کا ایک حصہ تھا۔ میرا نام لیوا تھا۔ میرے اصولوں کو آگے بڑھانے والا تھا۔ لیکن اس وقت میں نے دانستہ اصولوں کی بات نہیں چھیڑی۔ اس خوشی کے موقع پر میں دوبارہ جنگ چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر میں اسی طرح آنے جانے لگا۔ سوا مہینے کے بعد میری ساس نے کہا۔

"ہم نے بیٹی کو بہت عرصہ اپنے پاس رکھ لیا۔ اب تم اپنے گھر لے جاؤ۔"

"میں بھی بہت عرصے سے یہی چاہتا ہوں مگر آپ کی بیٹی راضی نہیں ہوتی۔"

ناہید نے کہا۔ "آپ میری بات مان لیں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

"جو باتیں میری دانست میں غلط ہیں۔ میں انہیں نہیں مان سکتا۔"

میرے سسر نے فیصلہ سنایا۔

"تو پھر تمہیں اپنی بیوی اور بچے کے اخراجات یہاں پورے کرنے ہوں گے۔ ہر ماہ ساڑھے تین سو روپے نان نفقہ کے لئے دینا پڑیں گے۔"

ان دنوں آج جیسی مہنگائی نہیں تھی۔ تنخواہ کم ملتی تھی۔ اس وقت مجھے چار سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ مکان کے کرائے اور بجلی پانی کی مد میں سو روپے چلے جاتے تھے۔ باقی تین سو روپے میرے اور ناہید کے کھانے کپڑے اور ناگہانی ضروریات میں خرچ

www.pklibrary.net

ہو جاتے تھے۔ میں نے سسر صاحب کو حساب بتاتے ہوئے کہا۔
"اگر میں نان نفقہ میں ساڑھے تین سو ادا کروں گا تو پھر میں کہاں رہوں گا اور کیا کھاؤں گا؟"

انہوں نے جواب دیا۔ ایکسٹرا آمدنی کرو۔ اگر نہیں کرسکتے تو چوری کرو۔ شادی کی ہے اور بچے کے باپ بنے ہو تو جس طرح بھی ہوسکے اپنی ذمے داریاں پوری کرو۔ اگر نہیں کروگے تو یہاں پھر نہ آنا۔ ہم تمہیں بچے کی صورت بھی نہیں دیکھنے دیں گے۔"

میں پریشان حال وہاں سے چلا آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ لوگ اتنی بڑی دنیا میں کسی ایک انسان کو بھی ایماندار رہنے کا موقع کیوں نہیں دیتے۔ اگر ناہید بچے کو لے کر میرے ساتھ رہتی تو چار سو روپے ماہوار میں ہم آسانی سے گزارا کرسکتے تھے لیکن اب صورت حال یہ تھی کہ اپنے بچے کو سینے سے لگا کر رکھنے کے لئے نادار اور غریب بچوں سے فیس کے نام پر ایکسٹرا آمدنی کرنا لازمی تھا۔ اگر میں پرائے بچوں کا استحصال کرتا تو پھر بے ایمانی کے راستے کھلتے چلے جاتے۔ تعلیم کا مقصد فوت ہوجاتا۔ نااہل بچوں کو رشوت لے کر امتحان میں پاس کردیا جاتا۔ ہمارے ملک کے کتنے ہی معلم ایسی مجرمانہ زندگی گزار رہے ہیں لیکن میں کیا کروں۔ میرا ضمیر کسی جرم کے معاملے میں میرا پارٹنر نہیں بنتا۔

میں یہ آخری فیصلہ سنانے کے لیے ناہید کے دروازے پر گیا کہ میں اپنے بچے کی خاطر دنیا کے تمام بچوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہاں جاکر پتہ چلا کہ ناہید بچے کو لے کر مجھ سے بہت دور حیدر آباد اپنے بھائی کے ہاں چلی گئی۔ جب تک میں اس کی شرائط تسلیم نہیں کروں گا' وہ واپس آکر اپنا اور اپنے بچے کا منہ نہیں دکھائے گی۔

پانچ برس گزر گئے۔ میں نے صبر کرنا سیکھ لیا۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۵۹ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اتفاق رائے سے بچوں کے حقوق کا عالمی منشور منظور کیا تو میری آنکھ میں آنسو آگئے۔ سارے عالم کے بچے میرے پاس تعلیم حاصل کرنے آتے تھے۔ ایک میرا اپنا ہی بچہ میرے پاس آکر نہیں پڑھتا تھا۔ اب وہ پانچ برس کا ہوگیا تھا۔

ناہید بچے کو لے کر کراچی آگئی تھی۔ میں اس سے ملنے گیا تو بچے کو چھپا دیا گیا۔ اب ان کے مطالبے میں شدت پیدا ہوگئی۔ میرے سسر نے کہا۔

www.pklibrary.net

تم نے پانچ برس تک بیوی بچے کے اخراجات پورے نہیں کیے۔ ہم بچے کو تمہارے حوالے کردیں گے کیونکہ وہ تمہارا ہے لیکن ہمارا قانونی مطالبہ ہے کہ بچے کو لے جانے سے پہلے ناہید کا حق مہراور پانچ برس کے اخراجات پورے کرو۔

میں نے جھلا کر کہا۔ "آپ لوگ میری شرافت سے فائدہ اٹھا کر مجھ پر ظلم کر رہے ہیں۔"

"تم نے میری بیٹی پر ظلم کیا ہے۔ تم نے پانچ برس تک اس کی خبر نہیں لی وہ کیا کھاتی پیتی ہے اور کس حال میں رہتی ہے۔ ہم شریف لوگ ہیں ورنہ اب تک قانونی چارہ جوئی کرتے تو تمہارے ہوش ٹھکانے آجاتے۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی یہی کر سکتا تھا۔ لیکن اپنے گھر کی عزت کو عدالت تک لے جانا نہیں چاہتا تھا۔"

"ارے تو اب لے چلو نا عدالت میں۔ پانچ برس میں پچاس روپے کی ترقی پانے والے ماسٹر میں کتنا دم خم ہے' یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ برخوردار خود کو بیچ کر بھی مقدمے کے اخراجات پورے نہیں کر سکو گے۔"

میرے سسر درست فرمارہے تھے۔ مجھ جیسا غریب اسکول ماسٹر مقدمے بازی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بیوی کا پانچ برس کا نان نفقہ مجھ پر قرض کی طرح تھا۔ وہ قرض میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے مہر کی رقم نہیں دے سکتا تھا۔ میں ایک ماسٹر تعلیم کے سوا کسی کو کچھ نہیں دے سکتا تھا۔

نو برس اور گزر گئے۔ ناہید اور اپنے بیٹے سے جیسے ہمیشہ کے لیے رشتہ ٹوٹ گیا۔ ناہید نے طلاق نہیں لی۔ شاید اس لیے کہ طلاق کے بعد بیٹا میرے پاس آجاتا۔ میں اس لیے طلاق نہ دے سکا کہ ایمانداری سے ساری عمر مہر کی رقم جمع نہیں کر سکتا تھا۔ میرے سب ہی جان پہچان والے میرے گھریلو حالات سے واقف ہوگئے تھے۔ وہ بظاہر میری ایمانداری اور اصول پرستی کی تعریفیں کرتے تھے مگر ڈھکے چھپے الفاظ میں مجھے الزام دیتے تھے۔ مثلاً ایک اسکول ماسٹر نے پہلے میری بہت تعریفیں کیں پھر کہا۔

"نظام صاحب آپ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے مگر یہ دنیا والے آپ کی قدر نہیں کرتے۔ میں نے کسی سے سنا ہے۔ مجھے یاد نہیں آرہا ہے کہ کس سے سنا ہے۔"

www.pklibrary.net

میں سمجھ گیا کہ وہ ماسٹر اپنے دل کی بات کسی دوسرے کے حوالے سے کہہ رہا ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"بہرحال ایسا تو کتنے ہی لوگ کہتے ہیں کہ آپ اپنی بیوی اور بچے پر ظلم کر رہے ہیں۔ آپ کی شریک حیات اگر کوئی غلط عورت ہوتی تو طلاق لے کر دوسری شادی کر لیتی لیکن اس وفادار عورت نے اپنی جوانی کے چودہ سال آپ کی جدائی میں گزار دیے۔"

"جدائی میں نہیں ضد میں گزار دیے۔"

"آپ جو کچھ بھی کہیں لیکن لوگ آپ کی بیوی کی حمایت میں بولتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ بچوں کی دنیا میں رہ کر بچے بن گئے ہیں۔ ایک عورت کی آرزوؤں اور امنگوں کو نہیں سمجھتے۔ آپ سینما اس لیے نہیں دیکھ سکتے کہ بچوں نے آپ کو وہاں دیکھ لیا تو یہی سمجھیں گے کہ فلمیں دیکھنا اچھی بات ہے۔ آپ کہیں تفریح کے لیے نہیں جاتے۔ آپ کے ساتھ آپ کی شریک حیات بھی گھر کی چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس مظلوم عورت کی تفریح کے لیے گھر میں کم از کم ایک ٹی وی تو ہونا چاہیے تھا۔ بہت سے اسکول ماسٹروں کے ہاں ٹی وی، ریڈیو، صوفے اور سنگار میز وغیرہ ہیں۔ آپ بھی یہ تمام سامان اپنے گھر میں لا سکتے ہیں۔ مگر کچھ لانے کے بجائے بیوی کو گھر سے نکال دیا۔ دیکھئے، میں نہیں کہتا۔ یہ دنیا کہتی ہے۔"

ہاں دنیا اسی طرح کہتی ہے، جس طرح وہ کہہ رہا تھا۔ ان دنوں امتحانات شروع ہونے والے تھے۔ میں مختلف جماعتوں کے لیے سوال نامے تیار کر رہا تھا۔ ہر سال کی طرح طلبا میرے پیچھے پڑ گئے کہ میں ان سوال ناموں کو پوشیدہ نہ رکھوں۔ انہیں کچھ بتا دیا کروں۔ دوسرے ماسٹروں نے سمجھایا کہ بچوں کو پہلے سے سوال کے پرچے معلوم ہو جائیں گے تو دوسرے اسکولوں کے مقابلے میں ہمارے اسکول کا رزلٹ بہتر ہو گا۔ لیکن میری طرف سے وہی پرانا انکار تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ بچے چند سوالات کے جواب طوطے کی طرح رٹ کر پاس ہو جائیں اور محض نمائشی تعلیم کی سند حاصل کریں۔

تقریباً دس برس گزر جانے کے بعد ایک دن یوں ہوا کہ میں ایک کلاس کے طلبا کی نگرانی کر رہا تھا۔ لڑکے ریاضی کے سوالات حل کر رہے تھے۔ میں نے دور بیٹھے ہوئے ایک طالب علم کو نقل کرتے دیکھ لیا اور اسے آواز دی۔

www.pklibrary.net

"جعفر نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اچھی صحت اور قد میں میرے برابر تھا۔ میں نے اسے بلایا تو اس نے طنزیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ پھر اپنی جیب سے چاقو نکال کر اسے کھولا۔ اس کے بعد چیلنج کے انداز میں چاقو کی نوک میز کی سطح میں پیوست کر دی۔ یعنی چاقو ایک معلم کے سینے میں بھی پیوست ہو سکتا تھا۔

میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ یہ ہمارے ملک کے بچے ہیں۔ یہ ہماری تعلیم ہے۔ قصور بچوں کا نہیں، ہماری طرز تعلیم کا ہے۔ اگر ہم تمام استاد صحیح اصولوں پر عمل کریں۔ طلبا کے جارحانہ اقدامات سے مرعوب ہو کر یا رشوت لے کر امتحانا ت کے سوال ناموں کو ظاہر نہ کریں تو بچوں کی نادان ضد بڑھتے بڑھتے خنجر کی نوک تک نہ پہنچے۔ میں نے جعفر کے قریب پہنچ کر کہا۔

"جب میں تعلیم دینے آیا ہوں تو تمہیں یہ بھی سکھاؤں گا کہ سچائی کو قائم رکھنے کے لیے پاکستانی بچوں کو تیر اور تلوار سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

یہ کہتے ہی میں نے چاقو کا دستہ پکڑ کر اسے اپنے قبضہ میں لے لیا پھر دروازے پر کھڑے ہوئے چپراسی سے کہا کہ وہ ہیڈ ماسٹر کو بلا کر لائے۔ تھوڑی دیر بعد ہیڈ ماسٹر تشریف لائے۔ انہوں نے صورت حال کو سمجھنے کے بعد مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔

"نظام صاحب! میری درخواست ہے کہ آپ جعفر کو پہلی وارننگ دے کر معاف کر دیں۔"

میں نے کہا "کاظمی صاحب! کسی بچے کی ابتدائی چوری کو نظر انداز کرنے کا مطلب ہوگا کہ ہم آئندہ اپنے معاشرے کے لیے اپنے ہاتھوں سے ایک بڑے چور کو ابھی سے تیار کر رہے ہیں۔ اگر یہ قانون دان بنے گا تو قانون کے مسودے چرا کر اس میں ترمیم اور اضافے کرے گا۔ اگر یہ حاکم بنے گا تو عوام کے سینوں پر خنجر کی نوک رکھ کر حکومت کرے گا۔ بچوں کے ذہن میں یہ خوف بٹھانا چاہیے کہ جرم کے بعد سزا لازمی ہوتی ہے۔"

"نظام صاحب! آپ جیسے سچے اور بااصول انسان سے کوئی بحث میں جیت نہیں سکتا۔ ہم سب آپ کی قدر کرتے ہیں لیکن جعفر محلے کے چیرمین کا لڑکا ہے اور چیرمین صاحب کے بہنوئی وزارت تعلیم کے شعبے میں ایک بہت بڑے افسر ہیں۔"

www.pklibrary.net

"ہونے دیجیے۔ ایک سچا حاکم اور افسر میرے اس اقدام کو سراہے گا۔ اور بے ایمان افسروں سے تو میں نے ڈرنا نہیں سیکھا ہے۔ پھر یہ کہ میں اس امتحان ہال کا نگراں ہوں مجرمانہ حرکت کرنے والے بچوں کا محاسبہ کرنا میرا فرض ہے۔ آپ صرف ہیڈ ماسٹر کی حیثیت سے جعفر کی کاپی پر یہ لکھ کر دستخط کردیں کہ میرا اقدام درست ہے۔"

ہیڈ ماسٹر کو میری ضد کے آگے دستخط کرنے پڑے۔ میں نے بھی اس کاپی پر دستخط کیے پھر جعفر کو امتحان ہال سے نکال دیا۔ ایک بجے امتحان کا وقت ختم ہوگیا۔ دو بجے میں اسکول سے نکل کر اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ ایک تنگ سی گلی سے گزرتے ہوئے نویں اور دسویں جماعت کے چھ طلبا نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان میں جعفر بھی تھا۔ میں نے کہا۔

"میرے بچو! میں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں کہ سچائی تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو سکتی ہے تمہارے ہاتھوں ہسپتال پہنچ سکتی ہے۔ مگر مر نہیں سکتی۔ میں اچھی باتیں سمجھاتا ہوں۔ تم سمجھنے کی کوشش کرو۔"

وہ سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ اچانک انہوں نے مجھ پر حملہ کردیا۔ ایک کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ اس ہاکی سے میرے سر پر ضرب لگائی گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ مجھے سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔ چاروں طرف سے لاتیں اور گھونسے پڑ رہے تھے۔ میں زمین پر گر کر ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

جب ہوش آیا تو میں ہسپتال کے ایک بستر پر پڑا ہوا تھا۔ میرے سر پر اور ایک ہاتھ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ شام کے وقت ایک پولیس انسپکٹر میرا بیان لینے آیا۔ اس نے میری خیریت پوچھنے کے بعد سوال کیا۔

"آپ پر کس نے حملہ کیا تھا؟ میرا خیال ہے وہ ایک سے زیادہ ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ وہ سب میرے اور آپ کے بچے تھے۔ نویں اور دسویں جماعت کے طلبا تھے۔"

میں ان کے نام بتانے لگا۔ انسپکٹر نے تمام لڑکوں کے نام لکھنے کے بعد کہا۔

"میں اپنی ڈیوٹی کے مطابق رپورٹ درج کرلوں گا لیکن اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلے گا۔ اوپر سے احکامات ملے ہیں کہ ملک کے سیاسی حالات خراب ہیں۔ طلبا کو نہ چھیڑا

www.pklibrary.net

جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک اسکول یا کالج کی اسٹوڈنٹ یونین کے کسی ایک طالب علم کو حراست میں لیا جائے تو تخریب پسند سیاستدان تمام اسکولوں اور کالجوں کے طلبا طلبات کو بھڑکا کر سڑکوں پر لے آتے ہیں۔ ماسٹر صاحب ہمارا ملک تعلیم کے بد ترین دور سے گزر رہا ہے۔"

"انسپکٹر صاحب! ہم سب بچوں کا عالمی دن مناتے ہیں۔ ہمیں پہلے یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر دور کے بچے جوان ہوتے ہیں۔ تو وہ دور ان کے مزاج کے مطابق بدلتا ہے اور بچوں کا ابتدائی مزاج والدین اور استادوں کے ذریعے بنتا ہے۔ میں نے ان بچوں کی خاطر اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ دیا۔ تمام ماسٹر ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ اپنی آمدنی پر قناعت کرنا بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔"

انسپکٹر نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"صرف قناعت کی بات نہیں ہے۔ میں اپنی تعریف نہیں کرنا چاہتا مگر سچ کہتا ہوں کہ میں رشوت یا حرام کے پیسے کسی سے نہیں لیتا۔ اس کے باوجود آپ کے اس کیس کو دیانت داری سے آگے نہیں بڑھا سکوں گا۔ میری ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اگر آپ کو اسکول سے نکال دیا گیا تو آپ ٹیوشن پڑھا کر گزارا کرلیں گے لیکن میری ملازمت چھوٹنے کے بعد میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ ان لڑکوں کو تنبیہہ کے طور پر تھوڑی بہت سزا ضرور ملے۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ چھ دن بعد ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ ساتویں دن اسکول پہنچا تو وہ تمام لڑکے ایک ساتھ آئے۔ جنہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹر اور اپنے بزرگوں کے سامنے کان پکڑ کر مجھ سے معافی مانگی۔ میں نے کہا۔

"اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اگر تم سب نیک نیتی سے معافی مانگ رہے ہو اور تم نے اس غلط روش کو چھوڑ دیا ہے تو میں تمہیں صدق دل سے معاف کرتا ہوں۔"

تمام ماسٹروں اور بزرگوں نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ پھر جعفر کے باپ نے کہا۔

"نظام صاحب! ریاضی کی کاپیاں آپ کے پاس جائیں گی۔ ان میں میرے بیٹے کی کاپی نہیں ہے کیونکہ آپ نے اسے امتحان ہال سے نکال دیا تھا۔ اب جب کہ آپ اسے صدق دل سے معاف کر چکے ہیں تو اسے صرف پاس مارک دے کر امتحان میں پاس

www.pklibrary.net

کردیں۔"

میں نے کہا۔ "چیرمین صاحب! میں آپ سب کے سامنے جعفر کو چند سوالات دیتا ہوں۔ اگر وہ انہیں حل کر کے پاس مارک حاصل کر لے تو یہ تعلیم دینے کا صحیح طریقہ ہوگا۔ آپ بھی فخر کریں گے کہ آپ کا بیٹا سفارش کے بغیر اپنی صلاحیتوں کے بل پر کامیاب ہوا ہے۔"

جعفر کا منہ لٹک گیا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر چیرمین کی سمجھ میں آگیا کہ بیٹا سفارش کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ دونوں باپ بیٹے نے سہارے کے لیے دوسروں کو دیکھا۔ اسکول کے ایک ماسٹر نے کہا۔

"نظام صاحب! آپ کبھی تو کسی کے لیے کچھ گنجائش رکھ لیا کریں۔ جعفر امتحان سے پہلے بیمار تھا اس لیے اچھی طرح تیاری......"

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ایک کار اسکول کے احاطے میں آکر رکی۔ چپراسی دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ ڈی سی طفیل احمد صاحب تشریف لائے ہیں۔ تمام لوگ ان کے استقبال کے لیے ہال سے باہر آگئے۔ طفیل احمد نے لوگوں کے ہجوم میں مجھے دیکھا۔ پھر چیرمین سے دریافت کیا۔

"کیا نظام صاحب سے تصفیہ ہو چکا ہے؟"

چیرمین نے جواب دیا "کس حد تک ہو چکا ہے؟" ماسٹر صاحب نے جعفر کو معاف کردیا ہے لیکن امتحان لیے بغیر اسے پاس کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔"

"اچھا میں بات کرتا ہوں۔" طفیل احمد مجھے اشارے سے بلا کر لوگوں سے ذرا دور لے گئے پھر آہستگی سے بولے۔

"تم سے بیوی چھوٹ گئی، بچہ چھوٹ گیا۔ اتنے برسوں کے بعد اب تو تمہیں عقل آجانی چاہیے۔ دیکھو میں زیادہ باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ میرا حکم ہے کہ جعفر کو پاس کردو۔"

"جناب میں جواب دے چکا ہوں۔"

انہوں نے دانت پیستے ہوئے مجھے دیکھا پھر کہا۔

ناہید اور تم سے میرا دور کا رشتہ ہے۔ اس لیے میں یہ بتا رہا ہوں کہ میری آٹھ سالہ

www.pklibrary.net

لڑکی فوزیہ سے جعفر کی نسبت طے ہو چکی ہے۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میری بیٹی کی ہونے والی سسرال میں میری سبکی ہوگی۔"

"جناب! یہ اسکول ہے۔ آپ رشتے داریوں کا واسطہ کیوں دے رہے ہیں۔"

"بے وقوف کے بچے......" یہ کہتے ہی انھوں نے ایک زور کا طمانچہ میرے منہ پر رسید کیا۔ جیسے میرا منہ گھوما ویسے ہی دنیا گھومنے لگی۔

کسی کا دماغ کب پھر جاتا ہے؟ جب اس کی خودداری اور ایمانداری کے منہ پر طمانچہ پڑتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ تیس برس سے جو تعلیم دیتا آرہا تھا۔ اس کی روشنی کی ایک رمق بھی نہ تھی۔ اتنی جدوجہد کے بعد اندھیرا میرے حصے میں آیا تھا۔

میں نے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے کبھی طمانچے مارے ہوں گے۔ اس دنیا کے بڑے اپنی انا کے لیے تمام علوم کے منہ پر تھپڑ مارتے ہیں۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ اچھا ہے کچھ نظر نہ آئے۔ میں بے حس انسانوں کے لیے اندھا بن جاؤں۔ میں اس دنیا کے لیے مرجاؤں۔ تب میں نے چیخ کر کہا۔

"میں تمہاری دنیا میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ میں زندہ نہیں......"

یہ کہتے ہی میں دھڑام سے فرش پر گر کر مرگیا۔

O☆O

میں نہیں جانتا کہ اس دن کے بعد میری زندگی کے دس برس ماضی کی قبر میں کیسے گزرے بعض حالات میں کتاب زندگی کے اوراق گم ہو جاتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں کچرا گھر تک کیسے پہنچ گیا۔ سوچنے سے سمجھ میں آتا ہے کے منہ پر طمانچہ کھاتے ہی توہین کا احساس اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ میرا ذہنی توازن برقرار نہ رہا۔ پھر بے ضرر پاگل سمجھ کر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا ہوگا۔

انسان اگر ہوش و حواس کھو بیٹھے اور کسی کام کا نہ رہے تو وہ انسانی سماج کا کچرا بن جاتا ہے اس لیے میں بھی کچرا گھر میں پہنچ گیا۔ وہاں بھی کچرا چننے والے بچے میرے پاس آتے تھے۔ میں مملکت کچرا آباد کا حاکم تھا۔ وہاں کا راشنگ آفیسر تھا۔ جو باسی اور جھوٹے کھانے جمع کرتا تھا۔ سکینہ اور دوسرے بچے خالی ڈبے، بوتلیں، کپڑوں کے

www.pklibrary.net

چیتھڑے، کاغذ اور بھوسی ٹکڑے وغیرہ چنتے تھے۔ سب کام کرتے تھے میں کسی کو تعلیم نہیں دیتا تھا کیونکہ تعلیم نے مجھے کچھ نہیں دیا تھا۔

اب میں علم کی بات کرتا ہوں تو چشم تصور میں وہی طمانچہ میرے منہ پر پڑتا ہے۔ لہٰذا میں طمانچے کھانے والی سچائی کا سبق کسی کو نہیں دے سکتا۔ لوگ کہیں گے کہ سچائی سے میرا ایمان اٹھ گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اٹھا نہیں بلکہ اٹھا کر کچرا گھر میں پھینک دیا گیا۔

وہ گمنام معصوم بچی میری گود میں تھی۔ نوازئیدہ بچے بہت جلد اپنے ماحول سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ میں اسے جہاں لٹاتا تھا، وہ وہیں سو جاتی تھی۔

اس بچی کے ماں باپ کون تھے؟ پہلے میں سمجھا تھا کہ بانو کے شوہر اور شازیہ کا یہ گناہ ہے۔ پھر کنیز نام کی ایک عورت اسے دودھ پلانے آئی تھی۔ اس کا بیان تھا کہ یہ اس کی اپنی بچی نہیں ہے وہ اپنے بچے کے حصے کا دودھ پلانے آئی تھی۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ خود اس کے شوہر نے اسے اس مقصد کے لیے کچرا گھر میں بھیجا تھا۔

اس رات کی صبح کنیز کا شوہر میرے پاس آیا پھر اس نے رازداری سے پوچھا۔

"بچی کے ساتھ جو پانچ ہزار روپے تھے، وہ کہاں ہیں۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ رقم تھانیدار نے لے لی ہے۔ پھر تھانیدار کی دھمکی یاد آئی۔ اگر میں یہ بات کہہ دیتا تو اس کچرا گھر سے بے دخل کر دیا جاتا۔ اب تو مجھے اتنی بڑی دنیا کے کچرا گھر میں رہنے کے لیے جھوٹ بولنا آگیا تھا۔ میں نے کہا

"اس بچی کے ساتھ پانچ ہزار روپے تو کیا پانچ پیسے بھی نہیں تھے۔ تم کون ہو؟ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟"

اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"بڑے میاں جھوٹ نہ بولو۔ اس بچی کا نانا لکھ پتی ہے۔ میں اس گھر کا ڈرائیور ہوں۔ وہاں کے تمام راز جانتا ہوں۔ میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے وہ بوڑھا لکھ پتی اپنی بیٹی سے کہہ رہا تھا کہ بچی کو اس علاقے کے کچرا گھر میں اس نے رکھ دیا ہے۔ کوئی نہ کوئی اسے اٹھا کر لے جائے گا۔ اس کی باسکٹ میں پانچ ہزار روپے رکھ دیے گئے ہیں۔"

اتنا کہہ کر ڈرائیور میرے ردعمل کو بھانپنے لگا۔ میں نے یوں بے پروائی کا اظہار کیا

www.pklibrary.net

جیسے وہ بکواس کر رہا ہو۔ اس نے کہا۔

"جس رات بچی کو یہاں پھینکا گیا تھا۔ اس کے دوسرے دن مجھے یہ بات معلوم ہوئی۔ میں یہاں آیا تو بہت سے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ تمہاری اور اس بچی کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ میں رات کو دوبارہ یہاں آنے کے خیال سے واپس چلا گیا۔"

میں نے کہا۔ "اچھا تو پانچ ہزار روپے مجھ سے حاصل کرنے کے لیے تمہاری بیوی نے اس بچی کو دودھ پلایا تھا۔"

"ہاں یہی سمجھ لو۔ نکالو پانچ ہزار......"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آج تک دنیا کے کسی بچے نے اتنا مہنگا دودھ نہیں پیا ہوگا۔ بھئی اسے ایک وقت دودھ پلانے کی کیا ضرورت تھی۔ تم اس کے بغیر ہی مجھ سے اتنی بڑی رقم مانگنے آسکتے تھے۔"

اس نے کہا۔ "میں اس بچی کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ تم میرا ساتھ دو گے تو ہم دولت میں کھیلیں گے۔ اس بچی کو زندہ رکھ کر اس کے لکھ پتی نانا کو بلیک میل کریں گے۔"

"اس کا نانا کون ہے۔"

"میں یہ راز نہیں بتاؤں گا۔ تم صرف میرے پارٹنر رہو گے۔ اس پانچ ہزار میں سے تمہیں پانچ سو روپے دوں گا۔"

"میرے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

"جھوٹ نہ بولو۔ میں تمہیں ایک ہزار دوں گا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میرے عقلمند بھائی! جب پورے پانچ ہزار میں ہضم کرسکتا ہوں تو تمہارا پارٹنر بن کر اپنے چار ہزار کا نقصان کیوں کروں۔"

اس نے غصے سے میرا گریبان پکڑ کر کہا

"مکار بوڑھے! میں تیرا گلا دبا دوں گا۔ زندگی چاہتا ہے تو روپے نکال کر سامنے رکھ دے۔"

"میں زندگی نہیں چاہتا۔ زندگی کا مذاق اڑانا چاہتا ہوں اسی لیے کچرا گھر میں بیٹھا

www.pklibrary.net

ہوں۔ تم مجھے دھمکی نہ دو البتہ میں تمہیں وارننگ دیتا ہوں کہ اگر تم نے میرا گریبان نہ چھوڑا تو میں چیخنا شروع کر دوں گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھیڑ لگ جائے گی۔ پولیس والے آجائیں گے پھر میں ان سے کہوں گا کہ تم بچی کے ماموں جان ہو......"

وہ گریبان چھوڑ کر مجھے گھورنے لگا پھر مجھے گھونسہ دکھاتے ہوئے بولا۔

"اب اگر تم نے مجھے بچی کا ماموں کہا تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔ میری بہن کی شادی اگلے ماہ ہونے والی ہے۔ وہ بے حیا' بے غیرت نہیں ہے۔ تو اسے بدنام کرے گا تو......"

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر میرا گلا گھونٹنے کی دھمکی دی۔ میں نے کہا

"تمہیں ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچنا چاہیے۔ بچی کے سلسلے میں میری گواہی سب سے اہم اور قابل قبول ہوگی کیونکہ بچی کو یہاں چھوڑ کر جانے والا میری نظروں سے گزرا ہوگا اور میں نے اسے پہچان لیا ہوگا۔ اگر تم کسی کی بہن' بیٹی کو بلیک میل کروگے تو میں یہی بیان دوں گا کہ تم اپنی بہن کا گناہ چھپانے کے لیے اس بچی کو میرے پاس چھوڑ گئے تھے۔"

وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ پریشان ہو کر میرا منہ تکنے لگا۔ اب وہ جابر اور سنگ دل بلیک میلر نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں کچرے پر بیٹھ گیا پھر ہارے ہوئے جواری کی طرح بولنے لگا۔

"میں نے اپنی بہن کو باپ بن کر پالا ہے۔ اسے گود میں کھلایا ہے اور اب ہر وقت اسے دلہن بنا کر رخصت کرنے کا خواب دیکھتا رہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ہم اپنے بھائیوں اور بہنوں کو بھی اولاد کی طرح پالتے ہیں۔ اپنے بچوں کی طرح ان کا مستقبل بھی اچھا بنانا چاہتے ہیں۔ بچوں کے اس عالمی سال میں ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم ان کے لیے کس انداز میں کیا کرنا چاہتے ہیں اور نتیجہ کیا نکلتا ہے؟"

اس نے کہا۔ "میں اچھے انداز میں بہن کی ڈولی اٹھانا چاہتا تھا۔ جب میری محدود آمدنی سے خواب پورے نہ ہوئے تو میں مالک کی کار سے پرزے اور پیٹرول چرانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی میں پکڑا جاتا تو میری بہن چور کی بہن کہلاتی لیکن ہم اپنے خوابوں کی تعبیر تک پہنچنے کے لیے برے انجام کا خطرہ مول لیتے ہیں۔"

www.pklibrary.net

"تو پھر خطرہ تمہارے سامنے ہے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم کسی دوسرے کی بہن کو کانٹوں میں گھسیٹ کر اپنی بہن کو پھولوں کا سہرا نہیں پہنا سکو گے۔"

"میں کسی کو بلیک میل نہیں کروں گا۔ تم مجھ پر مہربانی کرو۔ میری بہن کو اپنی بہن سمجھ کر اس کے جہیز کے لیے پانچ ہزار روپے دو۔"

میں نے کہا۔ "بہن میری ہوتی تو میں اسے جہیز میں یہاں کا کچرا دیتا۔ یعنی انسان کو اپنی اوقات کے مطابق لین دین رکھنا چاہیے۔ اگر تمہاری اوقات کے مطابق تمہاری بہن کو کوئی بیاہنا نہیں چاہتا تو سمجھ لو کہ وہ بے چاری بھی دوسری بے چاریوں کی طرح اس سماج کا کچرا ہے۔ اسے یہاں بھیج دو۔ یہاں کم از کم ردی خریدنے یا قبول کرنے والے تو آ ہی جاتے ہیں۔"

وہ غصے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا بس چلتا تو پانچ ہزار کے لیے مجھے قتل کر دیتا۔ مگر ہر شخص قتل کرنا نہیں جانتا۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس نے مجھے بچی کے لکھ پتی نانا کا نام نہیں بتایا۔ میں اس سے اس لیے نہ پوچھ سکا کہ یہ راز معلوم کرنے کے لیے اسے پانچ ہزار کی رشوت نہیں دے سکتا تھا۔

پورا ایک ہفتہ گزر گیا۔ بچی اپنے ماحول سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی۔ اسے وہاں کی غلاظت کا احساس نہیں تھا۔ بڑے گھر کے نخرے بھول گئی تھی۔ آرام سے کچرے میں پڑی، اپنے ہاتھ پاؤں جھٹک کر کھیلتی رہتی تھی۔ ایک شام کی بات ہے۔ ایک نوجوان کچرا گھر کے سامنے نظر آیا۔ وہ مجھے دور سے دیکھ رہا تھا بچی میری گود میں کھیل رہی تھی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے قریب آ کر بولا۔

"بڑے میاں کیا آپ میری عزت رکھیں گے؟"

اس نوجوان کا چہرہ دیکھ کر جانے کیوں اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کے چہرے پر بے شمار دکھوں کا سایہ تھا۔ میں نے کہا۔

"شاید تم یہ کہنے آئے ہو کہ یہ بچی تمہاری ہے۔ اور میں یہ بات کسی سے نہ کہوں؟"

"ہاں۔ مگر پہلے یہ یقین ہو جائے کہ یہ میری ہے۔ اس بچی کے ساتھ جو سامان تھا، وہ مجھے دکھائیں، میں پہچان لوں گا۔"

www.pklibrary.net

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا تو تم بھی پانچ ہزار کے لیے آئے ہو۔ جاؤ برخوردار اپنا کام کرو یہاں سے تمہیں ایک پیسہ نہیں ملے گا۔"

وہ خوش ہو کر بولا۔ "وہ تو یہ میری ہے۔ جس کی باسکٹ میں پانچ ہزار تھے۔ مجھے ایک پیسہ بھی نہیں چاہیے۔ بس مجھے یقین ہو گیا کہ یہ میری ہے۔"

یہ کہتے ہی اس نے بچی کو میری گود سے اٹھا کر چومنا شروع کر دیا۔ پھر ذرا منہ بنا کر بولا۔

"کیسی بو آ رہی ہے۔ کیا آپ اسے صاف ستھرا نہیں رکھ سکتے۔"

میں نے کہا۔ "سال دو سال میں کچرا گھر کی صفائی ہوتی ہے تو میں بھی غسل کر لیتا ہوں۔ جب وہ وقت آئے گا تو میں بچی کو بھی غسل کرا دوں گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بچی کو سینے سے لگا کر بولا۔

"خدایا میں نے کوئی گناہ نہیں کیا پھر میری بچی غلاظت کے جہنم میں کیوں پہنچ گئی؟"

"خدا سے کیا پوچھتے ہو؟ اولاد کی ذمے داری والدین پر ہوتی ہے۔ تم خود اپنے سوال کا جواب دو۔ اگر یہ گناہ نہیں ہے۔ تم گناہ گار نہیں ہو تو یہ کچرے میں کیسے پہنچ گئی؟ تمہاری بیوی 'اس بچی کی ماں کہاں ہے؟"

"بابا مجھ سے آپ کچھ نہ پوچھیں۔ میں نہیں بتا سکوں گا۔ اس کی ماں بہت معصوم اور مظلوم ہے۔ میں اسے بدنام نہیں کروں گا۔"

میں نے کہا۔ "کوئی دوسرا اسے بدنام کرے گا۔ تمہاری بیوی ایک لکھ پتی کی بیٹی ہے۔" وہ گھبرا کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پھر کہا۔

"اس کوٹھی کے ڈرائیور کو معلوم ہو چکا ہے کہ اس بچی کے ساتھ یہاں پانچ ہزار روپے آئے ہیں۔ وہ مجھ سے رقم وصول کرنے آیا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس بچی کے نانا کو بلیک میل کر کے آئندہ بھی رقمیں وصول کرتا رہے گا۔"

وہ خوف زدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ بدنامی کس طرف سے بڑھتی آ رہی ہے۔

"بیٹے!" میں نے نرمی سے کہا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے اس ڈرائیور کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ میرے تعاون کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکے

www.pklibrary.net

گا۔"

وہ مطمئن ہو کر مجھے احسان مندی سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"بابا! آپ بہت اچھے ہیں۔ میں آپ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔"

"چکا سکتے ہو۔ صرف اتنا بتا دو کہ جب تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ یہ بچی جائز ہے تو پھر یہاں کیوں پھینکی گئی۔"

وہ ہچکچانے لگا۔ میں نے اسے دھمکی دی کہ اگر وہ حقیقت نہیں بتائے گا تو میں بچی کو اس سے چھین لوں گا۔ اس کی گود میں نہیں جانے نہیں دوں گا۔ اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے کہا۔

جو کچھ مجھ پر، میری بیوی پر اور میری بچی پر بیت رہی ہے، وہ میں بتا رہا ہوں مگر کسی کا نام اور پتہ نہیں بتاؤں گا۔

"صرف اپنا نام بتا دو۔ تاکہ میں تمہیں مخاطب کر سکوں۔"

"بیٹا۔ آپ مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کریں۔ جب سے میں نے خون کے رشتوں کو سمجھنا شروع کر دیا۔ تب سے میری آرزو رہی کہ میرا کوئی باپ ہوتا اور مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کرتا۔"

میرے دل میں نشتر چبھنے لگے۔ یہ آرزو میری بھی رہی کہ میرا بیٹا کبھی سامنے آتا تو میں اسے بیٹا کہہ کر سینے سے لگا لیتا۔ میں نے بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! تم باپ سے محروم ہو اور میں بیٹے سے......"

"کیا وہ مر چکا ہے؟"

"نہیں، ایسا نہ کہو۔ میرا بیٹا زندہ ہوگا۔ ضرور کہیں اچھی زندگی گزار رہا ہوگا۔ کیا تمہارے والد کا انتقال ہو چکا ہے؟"

"نہیں، آپ ایسا نہ کہیں۔ وہ بھی یقیناً زندہ ہوں گے۔ پہلے میری امی غصے میں کہتی تھیں کہ وہ مر گئے ہیں۔ جب میں پندرہ برس کا ہوا تو انہوں نے بتایا کہ میرے والد بہت ہی ضدی اور اصول پرست ہیں اور ایک اسکول ماسٹر ہیں۔"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے تڑپ کر پوچھا۔

"کیا تمہارے والد کا نام نظام الدین ہے؟"

www.pklibrary.net

"آں؟" اب وہ چونک کر میرا منہ تکنے لگا۔ "آ۔ آپ کیسے جانتے ہیں؟ نہیں، نہیں میں اپنے والد کا نام نہیں بتاؤں گا۔"

"نام نہ بتانا اور بات ہے اور اپنے باپ کے نام کو تسلیم نہ کرنا اور بات ہے۔ جو اپنے باپ کے نام سے انکار کرتا ہے، وہ خود کو اور اپنی محترم والدہ کو گالی دیتا ہے۔"

وہ جھلا کر بولا۔ "آپ کو ایسی بات کہنے کی جرات کیسے ہوئی؟"

"عقل کی باتیں سمجھانے کے لیے جرات کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں اچھی بات سمجھائی ہے۔ ناراض کیوں ہوتے ہو؟"

اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں اپنی بچی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"نہیں بیٹے! یہ قانون کے کھاتے میں اور اخبارات کے کالموں میں آچکی ہے۔ اسے زبردستی لے جانا چاہو گے تو میں شور مچاؤں گا۔"

وہ نرم پڑ گیا۔ "میں آپ سے عزت کی بھیک مانگ رہا ہوں۔"

"میں تم سے تمہارے باپ کا نام پوچھ رہا ہوں لیکن نام بتانے سے پہلے اچھی طرح یقین کر لو کہ خود کو گالی نہیں دے رہے ہو۔"

وہ مجبور ہو کر بولا۔ "ہاں میرے والد کا نام نظام الدین ہے۔ اب سے دس برس پہلے میری امی نے مجھے بتایا کہ وہ اسکول ماسٹر ہیں تو میں ان سے ملنے کے لیے اس اسکول میں پہنچا۔ وہاں ہیڈ ماسٹر نے بتایا کہ وہ مینٹل ہسپتال میں ہیں۔ میں اپنی امی کو لے کر دماغی مریضوں کے ہسپتال میں گیا۔ وہاں پتہ چلا چونکہ وہ بے ضرر پاگل تھے، کسی کو ان سے نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا اس لیے انہیں جنرل وارڈ میں رکھا گیا تھا۔ پچھلی رات وہ اپنے بستر سے اٹھ کر چلے گئے اور اب تک واپس نہیں آئے۔ پتہ نہیں کہاں بھٹک رہے ہوں گے۔"

وہ کہہ رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ آنسو بھری آنکھوں کے سامنے میرے جگر کا ٹکڑا دھندلا رہا تھا۔ شام کی پھیلتی ہوئی تاریکی میں مجھے یوں لگا جیسے وہ پھر گم ہو جائے گا۔ میں نے تڑپ کر کہا۔

"بیٹے! اس سے پہلے کہ میں مر جاؤں، میرے سینے سے لگ جاؤ۔ میں ناہید کا شوہر

www.pklibrary.net

اور تمہارا باپ ہوں۔"

میری زبان سے اپنی ماں کا نام سن کر وہ چونک گیا۔ میں نے اس کے نانا کا نام بتایا تو مقناطیسی رشتوں نے اسے میرے سینے سے لا کر لگا دیا۔ میری خوشیوں کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس کا بیٹا بچپن میں بچھڑ گیا ہوں اور جوانی میں آکر گلے۔ سے لگ گیا ہو۔ تھوڑی دیر تک میں اسے چومتا رہا' وہ مجھے پیار کرتا رہا۔ میرے بدن سے کپڑے کی بو اٹھ رہی تھی۔ مگر جذبات کے ہجوم میں غلاظتوں کا احساس مٹ جاتا ہے۔

"ابا جان! آپ نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔"

میں نے کہا۔ "انسان کی امیدیں دم توڑ دیتی ہیں اور جب وہ خدا کی طرف سے ہونے والے فیصلوں کا انتظار نہیں کرتا تو وہ اسی حال کو پہنچ جاتا ہے۔ اب سے چھ برس پہلے ہی مجھے رفتہ رفتہ احساس ہونے لگا تھا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ یہاں کی ہر چیز کو ایک ہوشمند کی طرح سمجھ رہا ہوں۔ اس کے باوجود میں اس کچرا گھر میں بیٹھا رہا۔ اس لیے کہ میں اپنے اصولوں کو ہر قدم پر شکست کھاتے دیکھ کر تھک گیا تھا۔"

"بیٹے! میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کسی کو تعلیم نہیں دوں گا لیکن اب اپنی اولاد کو دیکھ کر غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ جب تک بچوں کی محبت قائم رہے گی' تعلیم کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ اگر مفاد پرست لوگ بچوں کو غلط تعلیم کا زہر پلا رہے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ آخری سانس تک اس زہر کا توڑ کرتے رہیں۔ اسکولوں اور کالجوں کو بچوں کا کچرا گھر بنانے کا موقع نہ دیں۔ کیا تم میری طرح معلم بنو گے؟"

میرے بیٹے نے ندامت سے سر جھکا کر کہا۔

"جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اور چھوٹی کلاس کے طلبا کو ٹیوشن پڑھا کر اخراجات پورے کرنا چاہتا تھا تو امی غصے سے کہتی تھیں۔ خبردار! اسکول ماسٹر کبھی نہ بننا۔ تم میرے بیٹے ہو۔ میرا بیٹا ڈپٹی کمشنر بنے گا۔ اس طرح یہ بات میرے دماغ میں بیٹھ گئی کہ مجھے معلم نہیں بننا چاہیے۔ اب تو میں ڈپٹی کمشنر بھی نہیں بن سکتا۔ میں آپ جیسے قابل استاد کا بیٹا' نویں جماعت سے آگے تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا۔"

میرے دل پر ایک پتھر سا لگا۔ میں نے صدمے سے چور ہو کر کہا۔

"بیٹے تمہیں آگے پڑھنا چاہیے تھا۔"

www.pklibrary.net

"کیسے پڑھتا؟ جب میں نویں جماعت میں اول آیا تو امی نے کہا یہ باپ کی ذہانت لے کر کیا کرو گے؟ تعلیم سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تمہارے جیسے نوجوان لڑکے ویلڈنگ کا کام سیکھ کر دبئی اور سعودی عرب جاتے ہیں اور ہزاروں روپے کما کر لاتے ہیں۔ تم ویلڈنگ کا کام سیکھو۔ میں تمہارے ڈی سی ماموں سے کہہ کر تمہیں سعودی عرب بھجوا دوں گی۔"

آہ! ناہید ہزاروں روپے کی آمدنی کا خواب مجھ سے پورا نہ کر سکی تو میرے بیٹے کے ہاتھوں اس کی تعبیر چاہتی رہی۔ والدین کی حرص اور آرزوئیں' اولاد سے تعلیم کا حق چھین لیتی ہیں۔ میرا بیٹا کہہ رہا تھا۔

"میں نے تعلیم چھوڑنے سے انکار کیا تو امی رونے لگیں۔ میرے دل نے کہا کہ آپ انہیں ساری عمر رلاتے رہے اب مجھے تو نہیں رلانا چاہیے۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ گھر میں پڑھتا رہا۔ جب دسویں جماعت کے امتحانات قریب آئے تو امی نے میرے ہاتھوں میں پاسپورٹ لا کر رکھ دیا۔ سعودی عرب میں میری ملازمت کا بندوبست ہو گیا تھا۔ میں نے امی سے التجا کی کہ مجھے دسویں پاس کرنے کا موقع دیں۔ وہ میری التجا کو انکار سمجھ کر پھر رونے لگیں۔"

افسوس! بعض عورتیں بیوی کے روپ میں آنسو بہا کر ناکام ہو جاتی ہیں تو آنسوؤں کا وہی حربہ اپنے بچوں پر آزماتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا۔"

پھر فوزیہ آ گئی۔ اس نے امی سے کہا کہ مجھے تعلیم مکمل کرنے دیں۔ امی کو جب پتہ چلا کہ میں اور فوزیہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں تو خوشی سے کھل گئیں۔ وہ شروع سے ہی بڑے گھر کی لڑکی کو بہو بنا کر لانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے مجھے دوسرے کمرے میں لے جا کر کہا۔

"ارے پگلے تو نے کیوں نہیں بتایا کہ فوزیہ تمہیں چاہتی ہے۔ اب میں تجھے ملک سے باہر نہیں بھیجوں گی۔ فوزیہ کے پپا تجھے کسی محکمے میں افسر لگا دیں گے۔ تو دس جماعت پاس کر لے۔"

دوسرے دن امی فوزیہ کے ہاں رشتہ مانگنے گئیں۔ وہاں ان کی بڑی بے عزتی ہوئی۔ فوزیہ کے پپا نے غصے سے کہا۔

www.pklibrary.net

"ناہید! اپنی اوقات سے بڑھ کر بات نہ کرو۔ تم برسوں پہلے اپنے شوہر کے لیے آئی تھیں کہ میں اسے اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنادوں۔ تمہارے شوہر نے بعد میں میری بے عزتی کی' اسے میں بھول نہیں سکتا۔ اس کے باوجود مجھے تمہاری غریبی پر ترس آیا تو میں نے تمہارے بیٹے کو سعودی عرب بھیجنے کا بندوبست کردیا۔ یہ سچ ہے کہ چھوٹے لوگوں کو زیادہ منہ نہیں لگانا چاہیے۔ اب تم اتنی منہ چڑھ گئی ہو کہ اپنے چھوکرے کے لیے میری بیٹی کا رشتہ مانگنے آگئی ہو۔ نکل جاؤ میرے گھر سے' اور خبردار ادھر کا رخ نہ کرنا......"

امی وہاں سے روتی ہوئی واپس آگئیں۔ ان کی زبانی تمام باتیں سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ ایک گھنٹے بعد فوزیہ مجھ سے ملنے آئی۔ میں نے اسے خوب سنائیں۔ وہ روتے ہوئے بولی۔

"آپ مجھے غصہ کیوں دکھا رہے ہیں۔ اگر پپا کا فیصلہ میرا فیصلہ ہوتا تو میں یہاں کبھی نہ آتی۔"

امی نے کہا۔ "فوزیہ! اگر تم میری بہو بننا چاہتی ہو تو ابھی فیصلہ کرو کہ میرے عامر سے شادی کرو گی۔ کل جمعہ کا مبارک دن ہے۔ میں تم دونوں کا نکاح پڑھوا دوں گی۔ شادی کے بعد پپا مخالفت نہیں کرسکیں گے۔"

فوزیہ اتنا بڑا قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی تھی۔ انکار بھی نہیں کرسکتی تھی۔ پھر امی نے اسے پیار محبت سے سمجھایا کہ وہ اپنے والدین سے بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ امی نے میرے نانا' نانی اور ماموں ممانی وغیرہ کو اپنا رازدار بنا کر دوسرے دن گھر میں بلایا اور ہمارا نکاح پڑھوا دیا۔

اس رات فوزیہ دلہن بن کر ہمارے گھر میں رہی۔ دوسرے دن امی نے فون پر فوزیہ کے والدین کو بتادیا کہ فوزیہ اب ان کی بہو بن گئی ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی اس کے والدین دوڑے چلے آئے۔ پہلے تو انہوں نے گرمی دکھائی پھر بات نہ بنی تو نرمی سے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ جو ہونا تھا' وہ ہوگیا۔ مگر فی الحال یہ بات چھپا کر رکھی جائے۔ ہم فوزیہ کو لے جاتے ہیں۔ تم اگلے جمعے عامر کی بارات لے کر آؤ تاکہ چار لوگوں میں ہماری عزت رہے اور ہم سب کے سامنے بیٹی کو دلہن بنا کر رخصت کریں۔"

امی راضی نہیں تھیں لیکن فوزیہ نے کہا۔

www.pklibrary.net

"عامر! میں نے آپ سے وفا کی' آپ کی بن گئی۔ اب آپ میرے والدین کی عزت رکھ لیں۔"

میں نے امی کو مجبور کیا تو انہوں نے فوزیہ کو اس کے والدین کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ میں شرافت میں مارا گیا۔ انہوں نے فوزیہ کو کہیں غائب کردیا۔ میں امی کے ساتھ وہاں گیا تو ڈرائنگ روم میں فوزیہ کا باپ ایک پولیس انسپکٹر کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"انسپکٹر! یہ وہی دونوں ماں بیٹے ہیں۔ اس عورت نے مجھے فون کیا تھا کہ میری بیٹی اس کی قید میں ہے۔"

امی نے کہا۔ "قید نہیں کیا تمہاری بیٹی کی مرضی سے میرے بیٹے کے ساتھ نکاح ہوا ہے۔"

انسپکٹر نے کہا۔ "اگر نکاح ہو چکا ہے تو یہ اچھی بات ہے۔ آپ مجھے فوزیہ سے ملائیں' میں اس کا بیان لوں گا۔"

"فوزیہ اپنے میکے میں ہے۔" میں نے کہا۔

"بکواس مت کرو۔" انسپکٹر ناگواری سے بولا۔ "وہ یہاں نہیں ہے۔ تم لوگوں نے اسے کہیں لے جا کر قید کردیا ہے۔"

اس بات پر بحث شروع ہوگئی۔ ہم کہہ رہے تھے کہ فوزیہ اپنے والدین کے ساتھ میکے آئی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے ایک شریف زادی کو اغوا کیا ہے۔ فوزیہ کے باپ طفیل احمد نے کہا۔

"تم ثبوت کے طور پر نکاح نامہ دکھاؤ گے تو اس نکاح میں شریک ہونے والے تمہارے تمام رشتے دار بھی حوالات میں پہنچا دیے جائیں گے۔ جب تک میری بیٹی کو پیش نہیں کرو گے' تم لوگوں کے ساتھ مجرموں کا سا برتاؤ کیا جائے گا۔"

ہم ماں بیٹے ناکردہ جرم کی سزا پانے والے تھے۔ جو نکاح نامہ ہم پیش کرتے' وہ اس بات کا ثبوت ہو جاتا کہ میں نے فوزیہ سے زبردستی نکاح پڑھوا کر اسے کہیں قید کردیا ہے تاکہ وہ قانون کے دروازے تک نہ پہنچ سکے۔ ہماری بے گناہی صرف فوزیہ کی موجودگی سے ثابت ہو سکتی تھی اور ہم نہیں جانتے تھے کہ اسے کہاں غائب کردیا گیا ہے۔ طفیل

www.pklibrary.net

احمد نے ہمیں اپنے بیڈ روم میں لے جا کر امی سے کہا۔

"ناہید تم نے میری عزت کو مٹی میں ملانے کی جو کوشش کی ہے۔ اس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ میں تم دونوں کو حوالات میں پہنچادوں۔ لیکن اب بھی میں مصلحتاً سمجھوتہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم وہ نکاح نامہ مجھے دے دو اور عامر میری بیٹی سے دستبردار ہوجائے تو میں انسپکٹر کو کچھ دے دلا کر رخصت کردوں گا۔"

میں نے ان کے قدموں میں جھک کر کہا۔

"آپ میری اور فوزیہ کی زندگی برباد نہ کریں۔ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہے گی۔"

انہوں نے مجھے دھکا دے کر فرش پر گراتے ہوئے کہا۔

"میرے سامنے لیلیٰ مجنوں کی کہانی نہ سناؤ۔ فوزیہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے۔ اب وہ تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ تمہاری ماں اچھی طرح جانتی ہے کہ اس کی منگنی بچپن ہی میں جعفر سے ہو چکی ہے۔ اگر نکاح نامہ واپس مل جائے تو یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہوگی کہ فوزیہ نے تم سے شادی کرنے کی حماقت کی تھی۔ اس کی شادی اگلے ماہ تک جعفر سے ہوجائے گی۔"

میرا دل گواہی دیتا تھا کہ فوزیہ مجھ سے نفرت نہیں کر سکتی مگر امی یہ نہیں چاہتی تھیں کہ میں ناکردہ جرم کی سزا پاؤں۔ انہوں نے کہا۔

"عامر میں نہیں جانتی تھی کہ فوزیہ نکاح کے بعد بدل جائے گی۔ اب تم بھی اس رشتے پر لعنت بھیجو میں گھر جا کر نکاح نامہ لے آتی ہوں۔"

میں نے اعتراض کیا۔ ایک بار فوزیہ سے ملنے کی التجا کی۔ مگر امی اب میری سلامتی کے لیے طفیل احمد کا ساتھ دے رہی تھیں۔ میری ایک نہ چلی۔ مختصر یہ کہ امی نے وہ نکاح نامہ لا کر واپس کردیا۔ میں نے فوزیہ کو طلاق نہیں دی۔ میرے طلاق دینے کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ اب اس بات کا کوئی تحریری ثبوت نہیں تھا کہ فوزیہ کبھی میری شریک حیات بنی تھی۔

میں گھر آکر فوزیہ کی جدائی کے غم میں بیمار پڑ گیا۔ وہ ایک رات کی دلہن بن کر آئی تھی۔ وہ ایک رات میری زندگی کا سرمایہ تھی۔ میں اسے کبھی بھلا نہیں سکتا تھا۔ بس ڈوبتے ہوئے دل سے انتظار کرتا رہا کہ ایک ماہ بعد جعفر کی دلہن بن جائے گی۔ میں دو رہی

www.pklibrary.net

دور سے اس کی کوٹھی کے چکر کاٹتا تھا مگر اس کوٹھی میں کوئی دولہا بارات لے کر نہیں آیا۔ پتہ چلا کہ شادی کی تاریخ آگے بڑھا دی گئی ہے۔

میرے دل میں پھر امید کی ایک کرن چمکنے لگی۔ دل نے کہا کہ فوزیہ شادی سے انکار کر رہی ہے اسی لیے شادی کی تاریخ ٹل رہی ہے۔ اسی طرح پانچ ماہ گزر گئے۔ فوزیہ کی شادی نہیں ہوئی۔ میری بے چینی بڑھ گئی۔ اس کی کوئی خیر خبر معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میں نے اس کی کوٹھی میں فون کیا۔ دوسری طرف سے اس کی والدہ کی آواز سنائی دی۔ میں نے کہا۔

"میں فوزیہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس کی ماں نے پوچھا۔ "تم کون ہو اور میری بیٹی سے کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس کی اب تک جعفر سے شادی کیوں نہیں ہوئی؟"

"شٹ اپ۔ تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟"

"ممی! غصہ کرنے کے بجائے ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ آپ ایک عورت ہیں۔ ماں ہیں۔ آپ کی بیٹی پر جو ظلم ہو رہا ہے' آپ ماں ہونے کے ناطے اسے کیسے برداشت کر رہی ہیں۔"

وہ چپ رہی۔ شاید ٹھنڈے دل سے سوچ رہی تھی۔ میں ایک ماں کی دکھتی رگ کو چھیڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پھر مجھے ہلکی سی کلک کی آواز سنائی دی اس نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ دوسرے دن میں نے پھر فون کیا۔ اس بار ایک ملازم نے ریسیور اٹھایا۔ میں نے کہا۔

"میں بیگم طفیل سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

جواب ملا کہ وہ پچھلی رات سے شہر سے باہر گئی ہیں۔ اس کے بعد تین ماہ تک فوزیہ کی والدہ سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ آج ابھی یہاں آنے سے پہلے میں نے اس کوٹھی میں فون کیا تو دوسری طرف سے آواز سنتے ہی میرا دل دھڑکنے لگا۔ وہ فوزیہ کی آواز تھی۔ میں نے کہا۔

"فوزیہ میں تمہارا عامر بول رہا ہوں۔ تم کہاں کھو گئی تھیں؟"

"عامر!" اس کے انداز تخاطب میں تڑپ اور بے چینی تھی۔ وہ بولی۔ "میں یہاں

www.pklibrary.net

سے فرار ہو کر تمہارے پاس پہنچنے ہی والی تھی۔ اچھا ہوا تم نے رابطہ قائم کر لیا۔ ہم لٹ رہے ہیں عامر! میں تمہاری بیٹی کی ماں بن چکی ہوں۔ مگر بیٹی میرے پاس نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم خوش خبری بھی سنا رہی ہو اور مایوس بھی کر رہی ہو۔ بتاؤ۔ ہماری بیٹی کہاں ہے؟"

"میں کیا بتاؤں۔ زچگی کے بعد میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہوش آنے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد مر گیا۔ میں نے رو دھو کر صبر کر لیا مگر آج پپا کا ایک ڈرائیور میرے پاس آیا۔ اس نے کہا۔

"بی بی اگلے ماہ میری بہن کی شادی ہے اگر آپ مجھے پانچ ہزار دیں گی تو میں آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں گا۔"

میں نے سمجھا کہ شاید وہ تمہارے بارے میں کچھ بتائے گا۔ میں نے اس کی مطلوبہ رقم دینے کا وعدہ کر لیا تو اس بتایا کہ میری بچی زندہ ہے اور طارق روڈ کے پیچھے ایک کچرا گھر میں ایک بوڑھے کے پاس ہے۔ یہ سنتے ہی میں نے ممی کے پاس جا کر ان کا گریبان پکڑ لیا۔ اور چیخ کر بولی۔

"آپ کیسی ماں ہیں؟ کیا آپ مجھے کچرا گھر میں پھینک سکتی ہیں؟ اگر نہیں تو بتایئے میری بیٹی کو کہاں پھینکا ہے۔ کیوں پھینکا ہے؟"

ممی نے روتے ہوئے کہا۔ "بیٹی! میں نے یہ ظلم نہیں کیا۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہارے پپا نے بہت پہلے ہی مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس تمہیں لے جا کر بچے کو ضائع کرا دوں مگر تم نے چار ماہ تک یہ بھید چھپا رکھا تھا۔ بچے کو ضائع کرنے کا وقت گزر گیا تھا اس لیے انہوں نے صبر کر لیا۔ جب بچی پیدا ہوئی تو میں ان کے راستے کی دیوار بن گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ بے شک آپ اپنی عزت کی خاطر بچی کو فوزیہ سے الگ کر دیں مگر اسے ہلاک نہ کریں۔ انہوں نے میری بات مان لی۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے تمہارے ماموں کو ان کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ دونوں کار کی پچھلی سیٹ پر بچی کو باسکٹ میں رکھ کر کہیں لے گئے۔ واپسی میں تمہارے ماموں نے بتایا کہ اسے پانچ ہزار روپے کے ساتھ ایک کچرا گھر میں چھوڑ دیا گیا ہے۔"

فوزیہ فون پر ساری داستان سنا رہی تھی پھر اس نے آنسو بھرے لہجے میں کہا۔

www.pklibrary.net

"عامر! وہ ہماری محبت کی نشانی ہے۔ فوراً وہاں جاکر اسے حاصل کرو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"

میں نے اس سے وعدہ کیا۔ اس نے بھی وعدہ کیا کہ جب میں فون پر اسے بچی کے ملنے کی خوشخبری سناؤں گا تو اس رات وہ میرے گھر چلی آئے گی اور مجھے ساری واستان سنائے گی کہ کس طرح اسے شہر سے دور لے جاکر قید کیا گیا تھا۔ بہرحال میں اپنی بچی کو یہاں لینے آگیا۔ آج تقدیر مہربان ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میری بیٹی اپنے دادا کی گود میں کھیل رہی ہوگی۔"

یہ کہہ کر عامر خاموش ہوگیا۔ میں نے بیٹے کو مسکرا کر دیکھا۔ پھر پوتی کو سینے سے لگا کر کہا۔

"بچوں کو تمام جائز حقوق ملنے چاہئیں۔ تمہارا حق ہے کہ تمہیں باپ کی محبت اور توجہ ملے۔ میں تمہیں آگے بڑھاؤں گا۔ یہ بچی بھی اپنا حق چاہتی ہے کہ اسے تمہاری اور فوزیہ کی گود ملے۔ تم بچی کو لے کر یہاں بیٹھو۔ میں اپنی بہو کو یہاں لے کر آؤں گا۔"

"ابا جان! اب اس کچرا گھر میں بیٹھنا کیا ضروری ہے؟ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

نہیں بیٹے! ہر شخص کا محاسبہ ہونا چاہیے۔ جس نے جو کچرا پھینکا ہے' وہ اپنا کچرا سمیٹنے خود آئے گا۔ تم مجھے اپنی ای اور فوزیہ کا پتہ بتاؤ۔"

میں پتہ معلوم ہونے کے بعد کچرا گھر کے اندر گیا۔ وہاں سے اپنی جمع پونجی اٹھائی۔ کل بائیس روپے اور ستر پیسے تھے۔ لنڈے بازار کا ایک سوٹ رکھا ہوا تھا۔ آنے والا دن میرے لیے عید کا دن ہوگا اور آج کی رات "شب برات" تھی۔ اس لیے اب غسل کرنا اور کپڑے بدلنا لازمی تھا۔ میں نے ایک حمام میں جاکر بال کٹوائے' شیو بنوایا۔ غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کیا۔ میرا حلیہ ایک دم ہی بدل گیا۔ آئینے میں خود کو دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ ضدی اور اصول پرست اسکول ماسٹر زندہ ہوگیا ہے۔

ناہید کے دروازے پر پہنچ کر میں نے دستک دی۔ یہ وہ دروازہ تھا جہاں سے میں ہمیشہ خالی ہاتھ واپس جاتا تھا۔ دروازہ کھلا تو ناہید یوں سہم گئی جیسے مردہ رات کے وقت زندہ ہو کر سامنے آگیا ہو۔ میں نے پوچھا۔

www.pklibrary.net

"مجھے پہچانتی ہو؟ پچیس برس سے ہمارے درمیان اصولوں کی جنگ جاری رہی۔ اب میں اس کا نتیجہ سننے آیا ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں نے اندر آ کر دروازے کو بند کیا تو وہ میری گردن میں بانہیں ڈال کر بڑی مدت کے بعد میری آغوش میں چھپ گئی۔

میں ہار گئی۔ میں آپ کو پریشان کرتی رہی کہ شاید اس طرح میرے گھر میں اونچی کوالٹی کا فرنیچر سنگار میز اور ریفریجریٹر جیسا سامان آجائے گا۔ آپ بے ایمانی پر آمادہ نہ ہوئے تو میں نے عامر کے ذریعے ہاتھ پاؤں مارے مگر کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔ میرے بیٹے کی تعلیم چھوٹ گئی۔ وہ دن رات پریشان رہتا ہے۔ اکثر راتوں کو میں نے سنا ہے' وہ نیند میں کراہتے ہوئے فوزیہ کو پکارتا ہے۔ اس کی کراہیں سن کر میرا کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔ میں کیا کروں؟"

"جب تم ہار چکی ہو تو تم کچھ نہ کرو۔ میں کروں گا۔ میں ہارنے کے بعد ایک بار پھر جیتنے کے لیے میدان عمل میں آگیا ہوں۔ عامر سے ملاقات ہو چکی ہے اور ایک خوش خبری سنو۔ ہماری ایک بہت ہی خوب صورت سی پوتی ہے۔"

ناہید نے چونک کر مجھے حیرانی سے دیکھا۔ میں نے کہا۔

"تمہیں بتانے کے لیے بہت سی باتیں ہیں۔ چلو، کے پاس چلیں۔ میں تمہیں راستے میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

وہ مجھ سے الگ ہو کر ایک صندوق کے پاس گئی۔ پھر اسے کھول کر میرا ایک پرانا لباس نکالا۔

"جب میں آپ کے گھر سے آخری بار نکل کر آئی تھی تو اپنے ساتھ آپ کا یہ لباس لے آئی تھی۔ آپ کے لباس سے عجیب سی بو آرہی ہے۔ آپ اسے بدل لیں۔"

میں نے کہا۔ "تعجب ہے' مجھ سے عداوت رہی اور میرے لباس کو بڑے جتن سے سنبھال کر رکھا ہے۔"

وہ سر جھکا کر بولی۔ "عداوت آپ سے نہیں' آپ کے اصولوں سے تھی۔ اب وہ بھی نہ رہی۔ جب عامر سو جاتا تھا۔ تب میں آپ کا لباس سینے سے لگاتی تھی۔ اسے چومتی تھی پھر آپ کو آنسوؤں سے پکارتے پکارتے سو جاتی تھی۔"

www.pklibrary.net

عورت کیا ہے؟ زحمت بھی ہے اور محبت بھی۔ وہ اپنی ضد اور انانیت کے ہاتھوں گھر کو جہنم بناتی ہے۔ شوہر سے الگ ہو جاتی ہے مگر اس کے لباس کو یا اولاد کو سینے سے لگا کر رکھتی ہے۔ یہ بھی محبت کی ایک ادا ہے لیکن بڑی مہنگی ادا ہے۔

لباس تبدیل کرنے کے بعد میں ناہید کے ساتھ طفیل احمد کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں' میں نے اپنی پوتی کے ملنے کی ساری داستان سنائی۔ ناہید سن رہی تھی اور بار بار خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ پچیس برس تک کانٹوں میں زندگی گزارنے کی بعد پھول جیسے نازک اور لہو جیسے مستحکم رشتے پھر آپس میں مل رہے ہیں۔

رات کے دس بجے ہم کوٹھی پر پہنچے۔ فوزیہ کی ممی نے دروازہ کھولا۔ طفیل احمد صوفے پر بیٹھے سگار کا کش لگا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سگار کا دھواں حلق میں پھنس گیا۔ کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ کھانستے کھانستے ان کے دیدے آنکھوں کے حلقوں سے اس طرح ابھر گئے۔ جیسے وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہے ہوں' پہچان رہے ہوں۔ میں نے کہا۔

"طفیل صاحب! اچھی طرح پہچان لیجئے۔ میں وہی مقتول ہوں جسے آپ نے ایک طمانچے سے قتل کر کے کوڑا کرکٹ کے قبرستان میں پہنچادیا تھا۔ اب یہ مردہ زندہ ہو کر تمہارا محاسبہ کرنے آیا ہے۔"

وہ کھانستے کھانستے بولے۔ "چلے جاؤ یہاں سے' بھاگ جاؤ......"

"خالی ہاتھ نہیں ہم اپنی بہو کو لے کر جائیں گے۔"

فوزیہ کی ممی دوسرے کمرے میں جا رہی تھیں۔ طفیل احمد نے غصے سے کہا۔

"یہاں تمہارا کوئی نہیں ہے۔ سیدھی طرح چلے جاؤ۔ ورنہ ملازم تمہیں دھکے دے کر نکال دیں گے۔"

"آپ نے پہلے بھی ایک بار اس کوٹھی سے دھکے دیئے تھے مگر آج تقدیر آپ کو دھکے دے رہی ہے۔ جو کچھ آپ نے بویا' اسے کاٹنے کا وقت آگیا ہے۔ اگر آپ فوزیہ کو ہمارے حوالے نہیں کریں گے تو وہ بچی ہمارے پاس ہے۔ مجبوراً ہمیں قانون کے ذریعے فوزیہ کا طبی معائنہ کروانا پڑے گا۔ تب یہ راز فاش ہو جائے گا کہ آپ کی بیٹی میری پوتی کی ماں بن چکی ہے۔"

طفیل احمد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ایک مردے کا چہرہ نظر آنے لگا۔ وہ ہکلاتے

www.pklibrary.net

ہوئے بولے

"تت...... تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کوئی بچی وچی تمہارے پاس نہیں ہے۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ نے اپنے جرم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن تقدیر کے اس مذاق کو کیا کہا جائے کہ ۳۱ر دسمبر اور پہلی جنوری کی درمیانی شب کو آپ کار میں بیٹھ کر کچرا گھر کے پاس آئے۔ آپ کا خیال تھا کہ آپ بچی کو کچرے میں پھینک رہے ہیں مگر قدرت یہ تماشا دیکھ رہی تھی کہ ایک نانا اپنی نواسی کو اس کے دادا کے پاس چھوڑ کر جا رہا ہے۔ میں وہاں موجود تھا کیونکہ تمہارے اعمال نے مجھے اس کچرا گھر میں دس سال پہلے ہی پہنچا دیا تھا۔"

وہ مجھے گھورتے رہے۔ میری باتوں کے وزن کو سمجھتے رہے پھر انہوں نے ڈھٹائی سے کہا۔

"میں سمجھتا تھا کہ اپنی بیٹی کو اپنی مٹھی میں رکھوں گا تو میری عزت رہ جائے گی۔ میں تم لوگوں کو بڑی سے بڑی رقم دینے کو تیار ہوں۔ تمہارے بیٹے کو اچھی ملازمت کے لیے ملک سے باہر بھجوا دوں گا۔ تم لوگ فوزیہ کا خیال چھوڑ دو۔ وہ جعفر سے شادی کے لیے راضی ہے۔ اسی لیے میں اسے یہاں لایا ہوں۔"

ان کی بات ختم ہوتے ہی فوزیہ کی ممی دوڑتی ہوئی آئیں اور ایک تہ کیا ہوا کاغذ اپنے شوہر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"فوزیہ راضی کب تھی۔ آپ اسے فریب دے رہے تھے۔ بیٹی آپ کو فریب دے کر یہاں آئی تاکہ یہاں سے فرار ہونے کا موقع مل جائے۔ اسے پڑھئے، وہ اپنی بچی کے پاس کچرا گھر میں گئی ہے۔"

"کچرا گھر؟" طفیل احمد نے بوکھلا کر کہا۔ اس کاغذ کی تحریر کو پڑھا پھر بھاگتے ہوئے باہر گئے۔ ہم سب ان کے پیچھے دوڑے۔ فوزیہ ان کی کار لے گئی تھی۔ انہوں نے ملازم سے چیخ کر کہا۔

"جاؤ بھاگو۔ جلدی سے ایک ٹیکسی لے کر آؤ۔"

ملازم بھاگتا چلا گیا۔ وہ اضطراب کی حالت میں کوٹھی کے احاطے سے باہر آ گئے۔ ہم ان کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے جھلا کر کہا۔

www.pklibrary.net

"تم لوگ میرے پیچھے کیوں آرہے ہو۔ بھاگ جاؤ یہاں سے......"

فوزیہ کی ممی نے کہا۔ "آپ نے اب تک اپنی سی کوششیں کرلیں لیکن ہونے والی بدنامی بدستور پیچھا کررہی ہے۔ بہتر ہے آپ اب گھر میں بیٹھ رہیں۔ بیٹی اپنی سسرال پہنچ گئی ہے۔"

انہوں نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ میں نے کہا۔

"بچی کے سلسلے میں رپورٹ درج ہوچکی ہے۔ آپ زندہ رہیں یا مرجائیں۔ یہ مقدمہ عدالت تک پہنچے گا۔"

اتنے میں ٹیکسی آگئی۔ طفیل احمد سے پہلے ہی ہم لپک کر ٹیکسی میں بیٹھ گئے۔ وہ انکار نہیں کرسکتے تھے۔ مجبوراً انہیں بھی بیٹھنا پڑا۔ راستے میں فوزیہ کی ممی نے کہا۔

"میں تسلیم کرتی ہوں کہ میری بیٹی آپ کی بہو ہے۔ اگر آپ چاہیں تو ہم سب مل کر اس بدنامی سے بچ سکتے ہیں۔ ہم یہ بیان دیں گے کہ بچی پیدا ہوئی تو کوئی بدمعاش اسے اٹھا کرلے گیا تھا اور کچرا گھر میں پھینک گیا تھا۔ ایسی ہی بہت سی باتیں بنائی جاسکتی ہیں۔"

میں نے کہا "سچائی کو بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ خود بخود چلی جاتی ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ میں نے دیانت داری سے تعلیم دینے کے لیے اپنی بیوی اور بچے کو چھوڑ دیا۔ آپ کے شوہر کے احکامات کو ٹھکرا دیا۔ زندگی کے دس برس کچرا گھر میں گزار دیے۔ میں آج بھی وہی پتھر ہوں۔"

"محترمہ! بچوں کے عالمی سال میں بڑوں کا محاسبہ ہوگا کہ ہم اسکول کے بچوں کے ساتھ، اپنے عامر اور اپنی فوزیہ کے ساتھ اور اپنی نواسی کے ساتھ کس طرح خود غرض ہوکر سلوک کرتے ہیں۔ نئی نسل کی سوچ میں جو زہر ہوتا ہے، وہ ہماری غلط پرورش اور غلط روش کے چور دروازے سے ان کے دماغوں میں پہنچتا ہے۔ ان معاملات میں نظام الدین اسکول ماسٹر سے سمجھوتا ناممکن ہے۔"

ہماری ٹیکسی کچرا گھر کے قریب پہنچ گئی۔ وہاں طفیل احمد کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ ہم نے ٹیکسی سے باہر آکر دیکھا۔ کچرا گھر میں ایک موم بتی روشن تھی۔ فوزیہ دیوار کی طرف منہ کیے میری پوتی کو دودھ پلا رہی تھی۔ عامر اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ فوزیہ نے سر گھما کر دیکھا پھر اونچی آواز میں بولی۔

www.pklibrary.net

"پپا! اگر آپ جھوٹی عزت کا کفن لپیٹ کر آئے ہیں تو یہیں مرجایئے۔ آپ کو پپا کہتے ہوئے میری زبان جلتی ہے۔ رسولؐ اللہ کا حکم تھا کہ بیٹیوں کو زندہ دفن نہیں کیا جائے گا۔ آپ کیسے مسلمان ہیں؟ آپ نے میری بیٹی کو کچرے کی قبر میں زندہ دفن کر دیا تھا۔ آپ کے دماغ میں کیسا کچرا بھرا ہے؟"

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ہماری آنکھیں بھی بھیگنے لگیں۔ درد کے رشتے محبت سے آنسو بہا رہے تھے۔ طفیل احمد ہولے ہولے بڑبڑا رہا تھا۔

"بیٹی! رات ہے۔ سناٹا ہے۔ دوسرے لوگ نہیں دیکھ رہے ہیں۔ اب بھی وقت ہے۔ میری عزت رکھ لو۔ واپس چلو بیٹی......"

ایسا کہتے وقت وہ بھی رو رہا تھا۔ مگر آنسوؤں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس کے دماغ کے کباڑ خانہ سے آنسو کچرے کی طرح آنکھوں کے راستے بہہ رہے تھے۔

○☆○